پاکیزہ آنچل

نئی دہلی

گھر کے ہر فرد کے لئے

25/-

ناولٹ

دروازہ کا شیشہ

مسرور جہاں

digest library.com

Digest Novels Lovers Group

خالد بھائی.....آداب!

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ ایک کہانی 'آواز کا رشتہ' ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی۔ غزالہ بہن کیسی ہیں۔ میرا آداب عرض کر دیں۔ بچوں کو [illegible]

والسلام
آپ کی بہن،
سرور جہاں، لکھنؤ

فون کی گھنٹی بجتے ہی رمشہ نے ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو۔" اس کی بے ترتیب سانس کے ساتھ نرم، میٹھی اور کومل کومل سی ہیلو کی آواز سن کر دوسری طرف سے بہت لہک کر 'ہیلو' کہا گیا۔ رمشہ کو یقین سا تھا کہ یہ وہی ہے۔

"جی؟ آپ کو کس سے بات کرنا ہے؟" اس نے بن کر پوچھا۔ ادھر جلترنگ سا بج اٹھا۔

"جی۔ آپ سے اور صرف آپ سے؟" بے ساختہ کہا گیا۔

"لیکن۔ میں تو آپ کو جانتی تک نہیں۔ پھر؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ دسیوں بار آپ سے بات ہو چکی ہے۔ پھر بھی؟" شکایتی لہجہ میں کہا۔

"اچھا۔ تو آپ ہیں؟" اترا کر اقرار کیا کہ پہچان لیا۔

"اوہ۔ شکر ہے۔ آپ نے میری آواز شناخت کر لی۔"

"جی ہاں۔ یہ غلطی تو مجھ سے سرزد ہوگئی۔ آپ بتائیں فون کس لیے کیا ہے؟" جان بوجھ کر جھنجھلائی۔

"آپ کی میٹھی میٹھی آواز سننے کے لیے۔"

"بس؟؟ میں سمجھی کوئی ضروری کام ہوگا۔"

"بھلا اس سے زیادہ ضروری کام اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"مائی گاڈ۔ باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔"

"دیکھ لیجیے۔ کتنی جلدی آپ نے ہمیں استاد مان لیا۔"

"استاد جی۔ آپ نے اب تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ تعارف بھی کرا دیں گے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ اب میں فون رکھ رہی ہوں۔"

"کیوں؟ اتنی دیر تو نہیں ہوئی کہ آپ بھاگنے کی سوچیں۔" شکایت وہ بھی اتنے اچھے انداز میں کہ رمشہ کو نشہ آ گیا۔ ہنس کر بولی۔

"دیکھیں نا۔ میرا فائنل اگزام ہونے والا ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں میں فیل ہو جاؤں؟"

"ارے نہیں۔ اگر ایسا ہے تو شب بخیر۔ پھر ملیں گے۔"

"شب بخیر۔" پہلے رمشہ نے فون رکھا پھر دوسری طرف سے بھی فون رکھنے کی آواز آئی۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے بستر پر دراز ہوگئی۔ کورس کی کتاب اٹھائی تو حروف نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ آنکھیں بند کر کے وہی آواز سننے لگی۔ جو کئی ہفتے سے اس کے روز و شب کو رنگین بنا رہی تھی۔ بس ایک دن اچانک ہی فون کی گھنٹی بجی تھی فون اسی نے اٹھایا تھا۔ دوسری طرف جو بھی تھا۔ پوچھ رہا تھا۔

"آپ کس نمبر سے بول رہی ہیں؟"

"کیا مطلب؟ فون آپ نے کیا ہے۔ تو یقیناً نمبر بھی معلوم ہوگا۔" اس نے جل کر کہا۔

"خفا نہ ہوں بس۔ وہ تو بس ایسے ہی نمبر مل گیا تھا۔"

"یعنی آپ نے بغیر نمبر جانے یوں ہی ایک نمبر ڈائل کر دیا۔ یعنی آپ اکثر ایسا کرتے ہیں۔ اور یہ آپ کی ہابی ہے۔ کیوں؟"

"اوہ دیکھیے پلیز۔ ناراض نہ ہوں۔ دراصل میں اپنے دوست کا نمبر ملا رہا تھا۔ بس اتفاق سے آپ کا نمبر مل گیا۔ اور آپ کی آواز۔ جی ہاں۔ آپ کی آواز نے ساتوں سر جگا دیے۔ اب میں اتنا خوش نصیب نہیں ہوں کہ ہر بار۔ بلکہ بار بار آپ کا نمبر اتفاق سے مل جائے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا میری بات۔"

"خوب سمجھ رہی ہوں۔ اگر میری آواز آپ کو پسند آگئی ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"آئندہ اپنی آواز سنا کر مجھ پر احسان تو کر ہی سکتی ہیں؟"

"مجھے احسان کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

اس نے کھٹ سے فون کاٹ دیا۔ اور کمرہ سے نکل آئی۔ بے وقت کی راگنی سننے میں اچھا خاصا وقت برباد ہو گیا تھا۔ ادھر کلپنا اس کی جان کو رو رہی ہوگی۔ کلپنا اس کی دوست تھی۔ وہ ساتھ ہی اسکول جاتی تھیں۔ اور اب کالج بھی ایک تھا۔ دونوں بی اے فائنل میں تھیں۔ ایک آدھ مضمون کا فرق تھا۔ لیکن دونوں کا زیادہ تر وقت ساتھ ہی گزرتا تھا۔ اس رانگ نمبر نے سب گڑبڑ کر دی تھی۔

وہ کلپنا کے گھر پہنچی تو پارٹی شروع ہو چکی تھی۔ کلپنا نے اسے دیکھ کر منہ پھلا لیا۔ اسے ہنسی آگئی۔

"ایک تو اتنی دیر سے آئی ہو۔ اور اب ہنس کر جلا رہی ہو؟"

"میں تو وقت سے آرہی تھی چلتے وقت ایک رانگ نمبر آگیا اس میں کئی منٹ صرف ہو گئے۔" رمشہ نے صفائی پیش کی۔

"اور۔ اگر غلطی سے زائیٹ نمبر ہوتا۔ تو تم گول ہو جاتیں؟"

"ارے نہیں بھئی! اب ایسا بھی نہیں ہے۔ اب لو اپنا گفٹ اور ناراضگی ختم کرو۔" رمشہ نے اسے لپٹا لیا۔

digest library.com

ایسے رانگ نمبر تو اکثر آجاتے تھے۔ دو ایک باتیں کر کے فون کاٹ دیا جاتا تھا۔ وہ بھی بھول بھال گئی۔ لیکن ایک دن پھر وہی رانگ نمبر آگیا۔ اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے کوئی بولا۔ اس کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مان گئیں مس۔ میرا جذبہ کتنا صادق تھا۔ آخر آپ کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ یعنی آپ کا نمبر تلاش کر لیا۔"

"واقعی مان گئی۔ آپ بے حد ڈھیٹ انسان ہیں۔ اب میرا نمبر کیسے مل گیا؟" وہ چڑ کر بولی۔

"اتنے دن سے یاد کر رہا تھا۔ اور یاد کر کر کے فون پر فون ملا رہا تھا۔ کہ آج اچانک آپ کا نمبر مل گیا۔"

"پھر تو رانگ نمبر کی وجہ سے خوب باتیں سننا پڑتی ہوں گی۔"

"اجی باتیں کیسی۔ گالیاں کہیے۔ سامنے ہوتا تو اچھی خاصی پٹائی بھی ہو جاتی۔ بس قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا۔"

"لیکن میرے ہاتھ سے نہیں بچیں گے۔" اس نے جل کر کہا۔

"کاش ایسا ممکن ہوتا۔" ایک سرد آہ کے ساتھ کہا گیا۔

"آپ کس قسم کے انسان ہیں آخر؟" وہ زچ ہو کر کہہ گئی۔

"یہ تو میرے ماں باپ کو بھی شاید ہی پتہ ہو۔"

"دیکھیے! میں آپ سے بہت شرافت سے کہہ رہی ہوں کہ آئندہ کبھی فون نہ کیجیے گا۔ میں ایک باعزت خاندان کی لڑکی ہوں۔ اور اس قسم کی باتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

رمشہ نے فون کاٹ دیا۔ لیکن دیر تک اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کے گھر کا ماحول بہت زیادہ مذہبی نہیں تھا۔ لیکن اتنا زیادہ آزاد خیال بھی نہیں تھا کہ لڑکیاں فون پر اوٹ پٹانگ باتیں مسکرائیں۔ یا رانگ نمبر کی حوصلہ افزائی کریں۔ تفریح کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اس کے پاپا فوج میں تھے۔ ان کی ڈیوٹی حالات کے تحت ملک میں کہیں لگ سکتی تھی۔ ان دنوں وہ ہمسایہ ملک کی سرحد پر تعینات تھے۔ گھر والے آبائی مکان میں اقامت پذیر تھے۔ پڑھائی کی وجہ سے انہیں ایک جگہ ٹک کر رہنا تھا۔ پاپا چھٹیوں میں گھر آتے تھے۔ اب تو وہ لوگ بھی اس کے عادی ہو گئے تھے۔ رمشہ کی امی ایک حوصلہ مند خاتون تھیں۔ رمشہ کے علاوہ دانیال تھا۔ جو ابھی ہائی اسکول میں تھا۔ کئی برس وہ دونوں بچوں کے ساتھ مکان میں بغیر کسی مرد کے رہیں۔ پھر ان کا بھانجہ بہروز گاؤں سے پڑھنے کے لیے ان کے پاس آ گیا۔ بقول رمشہ کے اس سے تو وہ پہلے ہی اچھے تھے۔ بہروز ایک دم سیدھا سادا نوجوان تھا۔ صورت شکل اچھی تھی۔ لیکن رہن سہن میں گنوار پن تھا۔ کالج جانے کے لیے اس نے جو کپڑے بنائے تھے۔ انہیں دیکھ کر رمشہ کو ہنسی آ گئی۔ پھولدار قمیض۔ تھیلا جیسی پتلونیں۔ ایک دو بورے جیسی جینز کی پتلونیں بھی بنائیں تھیں۔ ان کے ساتھ پہننے کے لیے جوتی شرٹس لی تھیں وہ بھی چیختے ہوئے رنگوں کی تھیں۔

"یہ آپ نے اپنی پسند سے ساری چیزیں خریدی ہیں؟"

پروین شاکر

تیری خوشبو کا پتا کرتی ہے
مجھ پہ احسان ہوا کرتی ہے
چوم کر پھول کو آہستہ سے
معجزہ باد صبا کرتی ہے
کھول کر بند قبا گل کے ہوا
آج خوشبو کو رہا کرتی ہے
ابر برسے تو عنایت اس کی
شاخ تو صرف دعا کرتی ہے
زندگی پھرتے فضا میں روشن
مشعل برگ حنا کرتی ہے
ہم نے دیکھی ہے وہ اجلی ساعت
رات جب شعر کہا کرتی ہے
شب کی تنہائی میں اب تو اکثر
گفتگو تجھ سے رہا کرتی ہے
دل کو اس راہ پہ چلنا ہی نہیں
جو مجھے تجھ سے جدا کرتی ہے
زندگی میری تھی لیکن اب تو
تیرے کہنے میں رہا کرتی ہے

☆.....☆.....☆

"جی ہاں۔ آپ کو پسند آئیں؟" بہروز نے خوش ہو کر پوچھا۔

"بہت..... بہت زیادہ... انہیں پہن کر آپ بہت اسمارٹ لگیں گے۔" رمشہ نے ہنسی کو ہونٹوں میں دبا کر کہا۔

"دوکاندار بھی یہی کہہ رہا تھا۔" مسکرا کر تعریف قبول کی۔

"ضرور کہہ رہا ہوگا۔ ہمارے شہر کے دوکاندار بہت سمجھ دار ہیں۔ وہ فوراً پہچان جاتے ہیں کہ کون

digest.library.com

شہری ہے اور کون کرلی سے آیا ہے۔" رمشہ نے صاف مذاق اڑایا۔

"کرلی؟ یہاں کرلی کا کیا ذکر ہے۔" وہ بھولے پن سے بولا۔

"اوہ۔ شاید آپ کو پتہ نہیں۔ کرلی ایک بہت مشہور جگہ کا نام ہے۔ جہاں کے لوگ بے حد عقلمند ہوتے ہیں۔" رمشہ کے گدگدی ہو رہی تھی۔ دانیال بول اٹھا۔

"بہروز بھائی۔ کرلی کے لوگ بے وقوفی کے لیے مشہور ہیں۔"

"اے شیطان! چپ رہ۔" رمشہ نے بھائی کو ڈانٹا۔

"سچ دانیال! تم کو معلوم ہے کہ..... کہ۔" بہروز ہکلایا۔ دانیال نے 'ہاں' میں گردن ہلا دی منہ سے کچھ نہیں کہا۔ بہروز سنجیدہ ہو گیا۔ رمشہ نے اس کی سنجیدگی محسوس کی لیکن اس پر ذرا ترس نہیں آیا۔ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

بہروز کئی دن چپ چپ رہا۔ پھر خود بخود اس کا موڈ اچھا ہو گیا۔ رمشہ کو اس کی کب پروا تھی۔ دانیال کی البتہ اس سے پکی دوستی تھی۔ رمشہ کو اپنے ننیہال کے لوگ کبھی اچھے نہیں لگے۔ سیدھے سادے دیہاتی لوگ۔ نہ بات کرنے کا شعور۔ نہ پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ۔ اس کی امی شہر کے کالج میں پڑھنے کی وجہ سے سلیقہ مند، مہذب اور اسمارٹ تھیں۔ ان کی دوست آسیہ نے انہیں اپنے بھائی نواز کے لیے پسند کیا تھا۔ جنہوں نے نیا نیا فوج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ نواز علی اکثر آسیہ سے ملنے کالج آتے تھے۔ وہیں انہوں نے اس کی ممی کو دیکھا اور بہن کی پسند کو اوکے کر دیا۔ پاپا کا خاندان فوج اور پولیس کی ملازمت میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک اسمارٹ اور ہینڈسم تھے۔ خاندان کی عورتیں بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ رمشہ کو شروع سے پاپا کے عزیزوں سے زیادہ محبت تھی۔ اسے ان سے ملنا جتنا اچھا لگتا تھا۔ البتہ ننیہال جانے میں سو سو بہانے کرتی تھی۔ اور جب سے بہروز کی شکل میں تنیہال گھر میں ہی آ گئی تھی اس کی بیزاری بڑھ گئی تھی۔ اور بے چارہ بہروز اکثر و بیشتر اس کا ہدف بنتا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وہ کالج میں پہنچ گئی۔ کالج کی پڑھائی اور دیگر مصروفیات میں اسے زیادہ وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اس طرح بہروز کی جان چھوٹ گئی۔ لیکن موقع ملتے ہی وہ اس کا مذاق اڑانے سے نہیں چوکتی تھی۔ لیکن ایک دن غضب ہو گیا۔ گاؤں سے خالہ جان آ گئیں۔ ممی تو بہن کو دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ اور رمشہ نے بس رسمی سلام پر اکتفا کی۔ نہ ان کی آمد کا کوئی خاص نوٹس لیا۔ نہ ہی مہمان سمجھ کر پذیرائی کی۔ اپنے روز مرہ کے معمولات میں مصروف رہی۔ ایک دن اس نے سنا خالہ جان کہہ رہی تھیں۔

"بہروز کے ابا اپنے خاندان کی لڑکی لانا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے سسرال والے پسند نہیں ہیں۔ میں نے تو بہروز کے ابا سے صاف کہہ دیا کہ میں اپنے بچوں کی شادی اپنی مرضی سے کروں گی۔ اور بہو تو میں اپنے خاندان سے لاؤں گی۔ خدا رکھے میرے خاندان میں ایک سے ایک اچھی لڑکی ہے۔"

"ضرور لائیے گا۔ آپ کا خاندان ماشاء اللہ کسی سے کم ہے؟" رمشہ نے دل میں کہا۔ اور مسکراتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ ان دنوں بہروز بہت خوش تھا اپنی اماں کو گاؤں پہنچانے گیا تو کئی دن کے بعد واپس آیا۔ اور اس کی امی کو ایک خط دے کر کہا۔

"آنٹی! یہ اماں نے دیا ہے۔ آپ اس کا جواب دے دیجیے۔" اس کی ممی خط پڑھ کر گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ رمشہ نے ماں کو متفکر دیکھا تو پوچھ لیا۔

"کیا بات ہے ممی خالہ جان نے کیا لکھا ہے؟"

digest library.com

"کچھ نہیں۔ تم جا کر اپنا کام کرو۔" ممی نے ٹالا۔

اس نے بھی کرید نہیں کی۔ بلکہ زیادہ پروا بھی نہیں کی۔ پاپا چھٹیوں میں گھر آئے تو ممی نے ان سے بہن کی خواہش کا ذکر کیا۔

"آپا نے بہروز کا رشتہ رمشہ کے لیے دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں؟" ان کی نظر میں بھی رشتہ بے جوڑ تھا۔

"لکھ دو کہ ابھی رمشہ پڑھ رہی ہے۔"

"انہیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ بہروز تعلیم پوری کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا۔ تب شادی کریں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اس میں ابھی بہت وقت ہے۔ خدا جانے آئندہ کیسے حالات ہوں۔ بہر حال انہیں فی الحال ٹال دو۔"

"وہ کوئی رسم کرنے کے لیے کہہ رہی ہیں۔"

"میں اس کے خلاف ہوں۔ پڑھنے والے بچوں کے ذہن ایسے قبل از وقت کی رسم سے پراگندہ ہو جاتے ہیں۔"

"پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ رمشہ کو بہروز سے اس قسم کی کوئی انسیت نہیں ہے۔ بلکہ وہ اکثر اس کا مذاق اڑاتی ہے۔ ایسے میں رشتہ وغیرہ کا سلسلہ کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔"

"تم انہیں سمجھا کر لکھ دو۔ رشتہ داری کا معاملہ ہے۔ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ویسے بہروز نیک اور شریف لڑکا ہے۔" پاپا نے رسانیت سے کہا۔

اب خدا جانے ممی نے کیا لکھا کیسے لکھا کہ ایک دن اچانک بہروز نے گھر سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا عذر تھا کہ ہوسٹل میں رہ کر وہ زیادہ محنت اور یکسوئی کے ساتھ پڑھائی کرے گا۔ اور آئندہ سال ایم بی اے میں داخلہ بھی لینا ہے وغیرہ وغیرہ۔

بہروز رہتا تھا تب بھی رمشہ اس سے کوئی مطلب نہیں رکھتی تھی۔ اس کے جانے سے اسے کوئی

digest library.com

پتے کی تبدیلی

قارئین اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں

قارئین و ایجنٹ حضرات سے گذارش ہے کہ اب تمام خط و کتابت سادہ ڈاک، رجسٹری، کوریئر، J-17, Jungpura Extn. کے بجائے صرف اور صرف نئے پتے پر بھیجیں۔ پرانے پتے پر بھیجی ہوئی ڈاک، کوریئر، رجسٹری کی ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

نیا پتہ

2/14-A, IInd Floor, Jangpura-A,
New Delhi-110014 - Ph. : 24373494, 24318864

2/14A، سیکنڈ فلور، جنگپورہ A، نئی دہلی۔ 110014

فرق نہیں پڑا۔ البتہ دانیال کئی دن بہت اداس رہا۔ خالہ کو بھی بھانجے کے جانے کا رنج تھا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ انکار کی وجہ سے بددل ہو کر بہروز نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی امی سے ہی آپا نے رمشہ کے لیے اس کا رشتہ دیا ہو۔ لیکن مجبوری تھی۔ رمشہ کسی بھی صورت میں اس رشتہ کے لیے تیار نہ ہوتی۔

بہروز کو گھر سے گئے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہوا تھا۔ جب دانیال نے رمشہ سے کہا۔

"بجو! بہروز بھائی کا فون ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"اف اور! کیا مصیبت ہے۔" وہ بددلی سے فون ریسیو کرنے گئی۔ اس کی آواز سن کر بہروز نے کہا۔

"آپ کیسی ہیں رمشہ؟"

"فائن! آپ بتائیں پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟"

"جی۔ ٹھیک چل رہی ہے۔"

"فون کیسے کیا؟"

"بس ایسے ہی سوچا آپ کی خیریت دریافت کرلوں۔"

"دریافت کرلی؟" چڑ کر بولی۔ غصہ بھی آیا۔

"جی۔ آپ سے کچھ پوچھنا بھی ہے؟"

"وہ بھی پوچھ لیجیے؟" دل پر جبر کر کے کہا۔

"جی۔ خود میری خواہش پر اماں نے رشتہ دیا تھا۔"

"کیا آنٹی نے آپ کی مرضی سے اماں سے رشتہ کے لیے انکار کیا تھا؟" رک رک کر پوچھا۔

"کیسا رشتہ؟ کس کا رشتہ۔ میں کچھ بھی نہیں؟"

"دراصل اماں نے آپ سے میرے رشتہ کی بات کی تھی؟"

"وہاٹ؟؟" رمشہ چیخ اٹھی۔

"آپ ہوش میں تو ہیں؟" وہ بلبلا کر یہی کہہ سکی۔

"جی! بالکل ہوش میں ہوں۔ کم از کم اس وقت تو ہوں۔"

"دیکھیے بہروز! میں آپ کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن ابھی میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں۔"

غصہ ضبط کرتے ہوئے رمشہ نے بڑی حلیمی سے کہا۔

"پڑھ تو میں بھی رہا ہوں۔ البتہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد۔"

"بہروز! کیا اتنے دن میں بھی آپ یہ بات نہیں سمجھے کہ میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔ معاف کیجیے گا۔ شادی کے لیے اولین ترجیح یہی ہوگی۔ یعنی میں جسے پسند کروں گی اسی سے شادی کروں گی۔ امید ہے آپ بھی سمجھ داری کا ثبوت دیں گے۔"

"کیا ضروری ہے کہ جسے آپ پسند کریں شادی اس سے ہو؟"

"آپ تو بحث کرنے لگے۔ بہرحال آئندہ اس

digest library.com

ہمارے ٹیلی فون نمبروں میں تبدیلی
Ph.: 24373494, 24318864, 26935645
پاکیزہ آنچل۔ ہما اردو ڈائجسٹ۔ مہکتا آنچل۔ خوبصورت انداز

موضوع پر آپ بات نہ کیجیے گا۔ اپنی زندگی اور مستقبل کا فیصلہ کرنا میرا حق ہے اور اس معاملہ میں میں اپنی امی اور پاپا سے بھی کمپرومائیز نہیں کروں گی۔ خدا حافظ۔"

رمشہ نے ریسیور رکھ دیا۔ اور غصے میں کھولتی ہوئی کمرہ میں گھس گئی۔

"بہروز کی اتنی ہمت؟ آخر یہ خود کو سمجھتا کیا ہے۔ گنوار، دیہاتی، جاہل نہ بات کرنے کا سلیقہ، نہ پہننے اوڑھنے کا شعور، شہر میں پڑھنے کیا چلا آیا۔ خود کو ہیرو سمجھنے لگا۔ ارے ایسے گنوار سے شادی کرنے سے اچھا ہے کہ میں بغیر شادی کے بیٹھی رہوں۔ لعنت ہے میرے اوپر جو میں بہروز جیسوں کے بارے میں سوچوں بھی۔"

چند دن کے بعد وہ بہروز کے فون کی بات بھول گئی۔ اور پھر زندگی میں کچھ میٹھے، انوکھے اور رنگین سپنے در آئے۔ ان سپنوں کا خالق ایک ان دیکھا انسان تھا۔ ایک اجنبی شخص لیکن اس کی آواز۔ اس کی باتیں ایسی دلچسپ ہوتی تھیں کہ وہ غیر شعوری طور پر اس کے فون کی منتظر رہنے لگی تھی۔ ادھر کئی دن سے اس کا فون نہیں آیا تھا اور وہ منتظر تھی جب بھی فون گنگناتا وہ لپک کر ریسیور اٹھا لیتی۔ لیکن ہر بار مایوس ہونا پڑتا۔ کئی بار کلپنا نے اسے ٹوکا بھی تھا۔

"کیا بات ہے رمشہ! ان دنوں تم کچھ اپ سیٹ رہتی ہو۔ اینی پرابلم؟"

"نہ... نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ کافی دن سے پاپا کا فون نہیں آیا ہے۔ سرحد پر حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ بس اسی لیے۔"

اس نے ٹالنے کے لیے کہا۔ حالانکہ کلپنا اس کی بچپن کی دوست تھی۔ ان میں آپس میں کافی بے تکلفی تھی لیکن فون والے اجنبی کی بات وہ اس سے بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ یقیناً کلپنا اس کی حماقت پر اسے

نعت مبارک

یوسف نظر بدھار

ہے صورت آپ کی، قرآں کی صورت یا رسول اللہؐ
فدا ہے آپؐ پر رب کی محبت یا رسول اللہؐ
یقیناً آپؐ سے محشر میں ہوگی بخششِ امت
سراپا، آپؐ ہو رحمت ہی رحمت یا رسول اللہؐ
نقوشِ پا پہ آقاؐ آپؐ کے جو شخص چلتا ہے
اسی کی دین و دنیا میں ہے عزت یا رسول اللہؐ
شریعت اور طریقت معرفت سب آپؐ پر قربان
خدا کی آپؐ ہو روشن حقیقت یا رسول اللہؐ
نہ ملتا کفر سے ہرگز ہمیں تا حشر چھٹکارا
ملی ہے آپؐ سے ایماں کی دولت یا رسول اللہؐ
غریب و بے نوا ہے آپؐ ہی کا وہ سگ در ہے
نظر کی بھی بدل دیجیے نا قسمت یا رسول اللہؐ

ڈانٹ پلاتی۔ کیونکہ وہ بہت عملی قسم کی لڑکی تھی اور ان کی دوستی بھی بہت ٹھوس بنیادوں پر استوار ہوئی تھی۔

بہر حال کلپنا نے اسے دلاسہ دیا۔ اور بظاہر وہ نارمل ہوگئی۔

رات کا دس بجا تھا وہ اپنے نوٹس بنا رہی تھی آج ہی لائبریری سے کتابیں ایشو کرا کے لائی تھی۔ اور کل واپس کرنا تھیں۔ فون کی گھنٹی بجی تو اس نے جھٹ ریسیور اٹھا لیا۔ فون وہ اپنے کمرہ میں ہی اٹھا لائی تھی۔ ایک امید موہوم جو ٹھہری۔

"ہیلو۔" اس نے روکھے لہجہ میں کہا۔

"کیا بہت غصے میں ہیں؟" دوسری طرف وہی تھا۔

"اوہ... تو آپ ہیں؟" اس نے گہری سانس لی۔

"جی... آپ کا خطاوار حاضر ہوں۔"

digest library.com

"کیا میں نے کچھ کہا ہے؟" شکوہ کیا، ناراض بھی تھی اس سے۔
"صاف تو نہیں کہا لہجہ بتا رہا ہے کہ آپ سخت خفا ہیں۔"
"اتنے دن کہاں غائب تھے۔" سیدھا سوال کیا۔
"تو یہ بات ہے۔ شکایت سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ نے میرے فون کا انتظار کیا ہے؟" طمانیت سے بات پوری کی۔ وہ اپنی کمزوری پکڑے جانے پر شرمندہ ہوگئی۔
"نہیں.... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس یوں ہی خیال آگیا۔"
"چلیے۔ یوں ہی سہی۔ خیال تو آیا۔"
"کہیں باہر گئے تھے؟" نہ چاہتے ہوئے بھی سوال ہونٹوں پر آگیا۔ دوسری طرف ہنسی کی آواز ابھری۔
"سوری... میں بتانا بھول گیا تھا۔ گھر جانے کا پروگرام تو پہلے سے تھا۔ گھر ہی چلا گیا تھا۔"
"کیا آپ باہر سے یہاں آئے ہیں۔ پڑھتے ہیں۔ یا ملازمت کا سلسلہ ہے؟" آج وہ اس سے پوری معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اب ایسی بھی کیا دھاندلی کہ نام پتہ ندارد نہ ضروری باتیں معلوم اور فون کے انتظار میں بیٹھی ہلکان ہو رہی ہے۔
"میں پڑھتا ہوں۔ ایم بی اے کر رہا ہوں۔ اور میں گاؤں سے یہاں پڑھنے آیا ہوں۔"
"آپ نے نام تک نہیں بتایا؟" شکوہ کیا۔
"اگر غلط بتادوں؟"
"آپ کی مرضی" خفگی سے کہا۔ وہ ہنس پڑا۔
"چلیے بتائے دیتا ہوں۔ میرا نام جمشید ہے۔ سب مجھے جمی کہتے ہیں۔ آپ کا جو دل چاہے کہہ لیں۔"
"میرا نام نہیں پوچھیں گے؟" بڑے مان سے کہا۔
"نہیں۔ میں نے اپنی پسند کا نام رکھ لیا ہے۔ وہی کافی ہے۔"
"کیا رکھا ہے بھلا۔ کچھ اوٹ پٹانگ سا ہوگا۔"
"آپ ایسا سوچتی ہیں۔ یعنی میرے اوپر اعتماد نہیں ہے۔"
"اتنی جلدی کیسے کوئی اعتماد کر سکتا ہے؟"
"یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر اپنا نام سن لیں۔ "خوشی" کیونکہ آپ میری زندگی میں خوشیاں لے کر آئی ہیں۔"
"اوہ۔" وہ شرما گئی کیسی پیاری بات کہہ دی تھی۔
"کیسا لگا اپنا نام؟" تعریف سننا چاہ رہا تھا شاید۔
"بہت اچھا۔ شکریہ۔" اس نے بھی اسے مایوس نہیں کیا۔
"شکریہ کس بات کا۔ یہ تو میں نے اپنی خوشی کے لیے رکھا ہے۔ خیر آپ اب اسٹڈی کیجیے۔ بہت وقت لے لیا میں نے۔"
"شب بخیر۔" اس نے بھی آہستہ سے شب بخیر کہا۔ اور فون کٹنے کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن ریسیور رکھنے کی آواز نہیں آئی تو اس نے پھر ہیلو کہا۔ اسی وقت فون رکھنے کی آواز آئی تو اس نے ٹھنڈی سانس لے کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر کہاں کی پڑھائی اور کیسی پڑھائی۔ وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔
ایک دن بہروز آگیا۔ وہ کالج سے آئی تو وہ امی کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس نے بے دلی سے رسمی طور پر سلام کیا اور اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو وہ جا چکا تھا۔ اس نے دل میں خدا کا شکر کیا۔ اور کچن میں جا کر اپنے لیے کھانا نکالنے لگی۔ امی وہیں چلی آئیں۔
"رمشہ میں کل گاؤں جا رہی ہوں۔ آپا کی طبیعت خراب ہے۔ بہروز یہی بتانے آیا تھا۔" امی

نے اطلاع دی۔

"لیکن امی! میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟"

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔ منی بوا آ کر رہ جائیں گی میں آج خود جا کر انہیں لے آؤں گی۔ اور پھر زاہدہ اور للن بھی تو ہیں۔ کام کی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہاں دانیال میرے ساتھ جائے گا۔"

"جلدی آیئے گا۔ یہ نہیں کہ ہفتہ بھر لگا دیں۔"

"دیکھو ابھی سے کیا کہہ سکتی ہوں۔ آپا کی طبیعت جیسی ہوگی ویسا کروں گی۔" امی فکرمند تھیں۔

"یہ بہروز بھی خوب ہیں۔ یہاں لا کر خالہ جان کا علاج کرانا چاہیے تھا۔ وہاں اچھے ڈاکٹر بھی نہیں ہوں گے۔ لیکن بہروز میں اتنی عقل ہوتی تب نا۔" تنفر سے کہہ کر پلیٹ اٹھائی۔

"ارے نہیں۔ وہ تو بہت سمجھ دار بچہ ہے۔ بتا رہا تھا کہ سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر بہت ہوشیار ہے۔ لندن سے پڑھ کر آیا ہے۔ گاؤں میں رہ کر غریبوں کا علاج کرنا اسے پسند ہے۔ ورنہ شہر میں اپنا ذاتی اسپتال کھول سکتا ہے۔" امی نے بہروز کی باتیں دوہرائیں۔

"خیر... آپ اپنے جانے کا انتظام کریں۔ یہاں میں دیکھ لوں گی۔ ہاں منی خالہ کو ضرور لے آئیں۔ ورنہ یہ للن تو سارا کام چھوڑ کر گھومنے نکل جائے گا۔ زاہدہ بھی وقت وقت سے آتی ہے۔"

"کیا کروں۔ مجبوری میں جانا پڑ رہا ہے۔ یوں تو اتنا بڑا خاندان ہے۔ لیکن آپا کے علاوہ اپنا سگا رشتہ دار کون ہے؟"

"کیوں کیا سارا خاندان سوتیلا ہے؟" جل کر کہہ دیا۔

"سوتیلا کیوں ہونے لگا۔ لیکن قریب کی رشتے داری بھی نہیں ہے۔" امی برا مان کر بولیں تو اسے ہنسی

दो दिन में मार्किट से ग़ायब

आख़िर ऐसी क्या बात है ?

पढ़कर देखिए

सुपर फ़ास्ट फ़ैमिली मैगज़ीन

महकता आंचल

जे-17, जंगपुरा एक्सटेन्शन, नई दिल्ली-110014

آ گئی۔ جلدی جلدی آخری لقمہ نگلا۔ پانی پیا اور باہر نکل آئی۔

دوسرے دن امی اور دانیال گاؤں چلے گئے۔ گھر میں سناٹا ہو گیا۔ منی خالہ کی وجہ سے اطمینان تھا۔ گھر کی فکر نہیں تھی۔ کالج میں ان دنوں پڑھائی کا زور تھا۔ امتحان قریب تھا اس لیے ہر ٹیچر کو کورس پورا کرانے کی دھن سوار تھی۔

کلپنا کسی رشتہ دار کی شادی میں باہر گئی ہوئی تھی۔ مجبوراً وہ فالتو وقت لائبریری میں گزارتی تھی۔ اس طرح پڑھائی بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن پڑھتے پڑھتے اسے جمی کا خیال آ جاتا تھا۔ خدا جانے کہاں غائب تھا۔ آج تک اس نے اپنا فون نمبر بھی نہیں دیا تھا۔ دیتا بھی کیسے کہتا تھا کہ پی سی او سے فون کرتا ہے۔ اور کبھی اپنے دوست کے گھر سے کر لیتا ہے۔ اپنا گھر تو تھا نہیں ہاسٹل میں رہتا تھا۔ یہ گاؤں والے بھی خوب ہوتے ہیں۔ رہیں گے شہر میں لیکن دوڑ دوڑ کر گاؤں ضرور جائیں گے۔ وہاں بھلا کیا ملتا ہے؟

بہروز بھی جب دیکھو گاؤں بھاگتا ہے۔ گھامڑ ایک نمبر کا ابھی تک پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی نہیں آیا۔ نہ بات کرنے کا ڈھنگ ہے۔ جمی بھی تو گاؤں کا ہے۔ لیکن کیسا دلنشیں انداز ہے بات کرنے کا۔ جی چاہتا ہے کہ وہ بولتا رہے۔ اور وہ سنتی رہے۔ ہو سکتا ہے کہ جمی اور بہروز ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ دونوں ہی یونیورسٹی میں ہیں۔ دونوں ایم بی اے کر رہے ہیں۔ کیا جمشید سے بہروز کے بارے میں پوچھنا مناسب ہوگا؟ نہیں یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ کچھ غلط بھی سوچ سکتا ہے۔ عورتوں میں تو صرف حسد کا مادہ ہوتا ہے لیکن مرد حضرات تو رقابت کے جذبے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ خود بخود ہنس پڑی۔

خدا خدا کر کے امی ایک ہفتہ کے بعد گاؤں سے واپس آ گئیں۔ بتایا کہ خالہ جان اب ٹھیک ہیں۔ بہروز انہیں پہنچانے آیا تھا۔ اس وقت وہ کالج میں تھی۔ اس لیے اس کا سامنا نہیں ہوا۔ اس کو بھلا کیا فکر تھی۔ اچھا ہی ہوا جو وہ گھر پر نہیں تھی۔

دوسرے دن اتوار تھا اس نے سوچا کہ اپنے کمرہ کی صفائی کر ڈالے۔ للن کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا۔ ذرا سی دیر میں اس نے ایسا عاجز کیا کہ ایک چانٹا مار کر اسے بھگا دیا۔ صفائی کر کے فارغ ہوئی تو گھنٹہ بھر باتھ روم میں لگ گیا۔ شاید اب بھی نہ نکلتی کہ کلپنا نے دروازہ ٹھونک پیٹ کر اپنے آنے کا اعلان کیا۔

"دروازہ نہ توڑ دو۔ نکل رہی ہوں۔ اور ذرا مار کھانے کے لیے تیار رہنا۔ میں تو سمجھی تھی کہ کہیں مر پھنک گئی ہوگی۔"

رمشہ نے باہر آتے ہوئے کہا۔ کلپنا آرام سے اس کے بیڈ پر لیٹی تھی۔ وہ بھی دھم سے اس کے اوپر لد گئی۔

"ہٹ پرے۔" کلپنا نے اسے دھکیلا۔ رمشہ نے ایک گھونسا جڑ دیا۔ کچکچا کر بازو کا بکوٹا بھرا تو وہ بلبلا گئی۔

"یہ بتاؤ اتنے دن سے کہاں غائب تھیں؟"

"شادی میں گئی تھی۔ بتایا تو تھا۔" کلپنا اپنا بازو سہلانے لگی۔

"کہیں اپنا بیاہ رچانے تو نہیں بیٹھ گئیں؟" جل کر کہا۔

"وہ کہہ تو رہا تھا کہ لگے ہاتھ ہمارے بھی پھیرے ہو جائیں۔"

"وہ.... یہ وہ، کہاں سے آ گیا؟" لہک کر پوچھا۔

"بنگلور سے آیا تھا۔ وہاں کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں منیجر ہے؟"

"اچھا.... تو یہ بات ہے۔ نام کیا ہے۔ دیکھنے میں کیسا ہے؟"

"نام تو اس کا ابھے ہے۔" کلپنا نے اترا کر بتایا۔

digest library.com

"اچھا جب ہی تو نے اتنے دن لگا دیے؟ اب کیا پروگرام ہے۔ امتحان دے گی یا نہیں؟"

"امتحان ضرور دوں گی۔ ابھی تو میرے ساتھ ہی آرہا تھا۔ لیکن میں نے منع کر دیا۔ اس کے گھر والوں نے تو فوراً رشتہ پکا کر دیا۔ بہت ایڈوانس لوگ ہیں۔ اس کے ڈیڈی ریٹائیرڈ میجر ہیں۔ اور ممی، بوتیک چلاتی ہیں۔ دو بہنیں امریکہ اور کناڈا میں سیٹل ہیں۔ "ابھے" ان سے چھوٹا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ تھوڑے دن یہاں کام کر کے تجربہ حاصل کر لے۔ پھر امریکہ یا کناڈا میں جاب کرے گا۔ کناڈا والے بہنوئی کا اپنا ہوٹل ہے۔"

"بڑا لمبا ہاتھ مارا ہے۔ یہ کہہ شادی میں جانا مبارک ثابت ہوا۔" رمشہ بہت خوش تھی۔

"امتحان کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہے؟" کلپنا نے پوچھا۔

"میں سوشل سائنس میں ایم اے کروں گی۔"

"اور شادی۔؟ وہ بہروز والا معاملہ تو تم نے ختم کر دیا۔ ورنہ مزے سے گاؤں میں رہ کر کھیتی باڑی کرتیں۔ دودھ، مکھن کھاتیں، جانوروں کی سانی کرتیں۔" کلپنا نے سوکھا منہ بنا کر کہا۔ تو وہ ہنس دی۔

"چل کمبخت۔ خود تو امریکہ کناڈا کے خواب دیکھ رہی ہے۔ اور مجھے گاؤں چلتا کرنے کا پروگرام بنا رہی ہے؟"

"خیر چھوڑا۔ اب اچھی چائے پلاؤ۔ اور کچھ کھانے کے لیے بھی لاؤ۔ بک بک کر کے دماغ چاٹ لیا۔" کلپنا نے اسے دھموکا رسید کیا۔ رمشہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ کلپنا نے فون اٹھا لیا۔ "ہیلو، کہا ہی تھا کہ فون کٹ گیا۔"

"عجیب پاگل انسان ہے۔" کلپنا بڑبڑائی۔

"کون پاگل ہے؟" رمشہ اندر آتے ہوئے بولی۔

"فون والا۔ میں نے ہیلو کہا ہی تھا کہ جھٹ فون کاٹ دیا۔"

"رانگ نمبر ہوگا۔ آواز پہچان کر فون کاٹ دیا۔"

"لیکن تمہارے چہرے کے رنگ تو کچھ اور کہہ رہے ہیں؟" کلپنا مسکرائی۔ رمشہ نے جلدی سے اپنے چہرہ پر ہاتھ پھیرا۔ جیسے رنگ چھپانا چاہ رہی ہو۔ کلپنا نے نعرہ مارا۔

"چور پکڑا گیا۔ بتاؤ کس کا فون تھا؟"

للن چائے کی ٹرے رکھ گیا۔ اس نے چائے بنا کر کلپنا کو تھمائی آہستہ سے کہا۔

"میں کیا جانوں کس کا فون تھا۔ رانگ نمبر تو

غزل

مظفر شاہ آبادی

خواہشوں کے لیے لاؤ لشکر چلا
جیتنے ساری دنیا سکندر چلا

زندگی نام حرکت کا ہے اس لیے
قطرہ قطرہ سمٹ کر سمندر چلا

یہ حقیقت ہے منزل اسی کو ملی
راہبر سے ذرا سا جو ہٹ کر چلا

آگ میں جھونک کر اس زمیں کو بشر
لے کے بارود اب آسماں پر چلا

کارواں کے لیے یہ رہا ان دنوں
راہزن کے اشارے پہ رہبر چلا

زیست کی تیز تلوار کی دھار پر
کوئی رو کر چلا کوئی ہنس کر چلا

آسماں جیسی اس کو بلندی ملی
سر ہمیشہ جو اپنا جھکا کر چلا

عشق جس نے کیا حق سے منظر میاں
سر ہتھیلی پہ اپنا وہ لے کر چلا

digest library.com

آتے رہتے ہیں؟"

"یہ تم کہہ رہی ہو۔ فون کا ذکر سنتے ہی خوشی سے چہرہ گلنار ہوگیا۔ اور پھر بھی انجان بن رہی ہو۔" جلدی اگلو کیا معاملہ ہے۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ چھ بجے تک ابھے کا فون آئے گا مجھے گھر پہنچنا ہے۔" کلپنا نے دھونس دی۔

"اچھا... اسی لیے جلدی کر رہی ہو۔ ایسا کرو تم یہیں سے اسے فون کرلو۔ بے چارہ انتظار کر رہا ہوگا۔" رمشہ نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ لیکن وہ کہاں ماننے والی تھی۔ اس کے سر ہوگئی تب اس نے اسے جمشید کے بارے میں بتادیا۔ آخر میں کہا۔

"پورے دس دن کے بعد فون آیا ہے۔"

"وہ بھی میری ایک 'ہیلو' نے ستیاناس کردیا۔ سو سوری ڈیئر۔"

"بکو نہیں۔ اب رات میں فون کرے گا۔"

"اتنا یقین ہے؟ لیکن ایک بات غور سے سنو۔ تم میری جان، میرا پیار اور نہ جانے کیا کیا ہو اس لیے کہہ رہی ہوں۔ یہ ٹیلی فونک لو، قابلِ بھروسہ نہیں ہوتا۔ نہ تم اسے جانتی ہو۔ نہ پتہ ٹھکانہ معلوم، نہ کبھی دیکھا ہے۔ پھر ایسی محبت کا کیا بھروسہ۔ اس سے ذرا ساری باتیں معلوم کرو۔ اس کی اصلیت کا پتہ لگاؤ۔ تب قدم آگے بڑھاؤ۔ یہ نہ ہو کہ وہ صرف مذاق کر رہا ہو۔ ٹائم پاس کر رہا ہو اور تم سیریس ہو جاؤ۔ تو پتہ چلے کہ سب ایک مذاق تھا۔ محض دل بہلاوا تھا۔ تب کیا کروگی؟"

"ایسا نہیں ہوگا۔" بڑے یقین سے کہا۔

"کیا اس نے تم سے کوئی وعدہ کیا ہے۔ اپنے پریم کا اظہار کیا ہے؟"

"نہیں... ایسا کچھ نہیں ہے۔ لیکن اس کی باتیں اس کے جذبوں کا پتہ دیتی ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ سچا اور مخلص ہے۔"

"صرف فون پر چند باتیں کرلینے سے کوئی سچا نہیں ہوجاتا۔ لڑکے ایسی دلچسپیاں تلاش کرکے مزہ لیتے ہیں۔ لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ خود کئی بار مجھے بھی ایسے فون آئے ہیں۔ اب بغیر لڑکے کی صورت دیکھے اس سے ملے بغیر کوئی کیسے پیار کرسکتا ہے۔ کیا تم اتنی بے وقوف ہو؟ مجھے یقین نہیں آتا۔"

کلپنا سنجیدہ ہوگئی تو وہ بھی سوچ میں ڈوب گئی۔

"کیا سوچنے لگیں۔ میری مانو تو اس قصے کو یہیں ختم کردو۔"

"ختم کردوں؟" کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں.... ختم کردو۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔" کلپنا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ محبت سے کہا۔

"رمشہ! ہم لڑکیاں بہت جذباتی ہوتی ہیں۔ اس لیے دھوکہ بھی جلدی کھاتی ہیں۔ ابھے نے دو چار بار دلداری کی باتیں کیں میں نے صاف کہہ دیا کہ یہاں میرے اور تمہارے ماں باپ موجود ہیں۔ اگر تمہارے دل میں سچ مچ میرے لیے کوئی بات ہے تو اسے ایک رشتے کا نام دے دو۔ ورنہ ختم کرو۔ چار دن کے بعد تم کہاں۔ اور ہم کہاں۔ بس غریب گھبرا گیا۔ فوراً اپنی ممی کے سر ہوگیا کہ مجھے کلپنا سے بیاہ کرنا ہے۔ اس کے ماں باپ سے بات پکی کرلیں۔ انہوں نے بیٹے کی سنجیدگی کو دیکھا پرکھا تو جھٹ رشتہ پکا کردیا۔ میری چچیری بہن کا دیور ہے۔ دیکھے بھالے لوگ ہیں اس لیے کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔ تم جمشید کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"میں خود سے کیا کہوں۔ یہ سب تو اسے کہنا چاہیے۔"

"بس تم صاف صاف کہہ دو کہ یہ ساری باتیں تمہیں پسند نہیں ہیں۔ اگر سیریس ہے تو تمہارے گھر والوں سے بات کرکے رشتہ پکا کرے۔ ورنہ رومانس بگھارنے کے لیے کوئی اور نمبر ٹرائی کرے۔"

"وہ کیا سوچے گا؟"

"یہی کہ لڑکی شریف ہے۔ عشق کی ماری نہیں ہے۔ ہر رشتے کی ایک ٹھوس بنیاد ہونا چاہیے۔ ہوا میں محل نہیں بنتے۔ اور اگر نقصان ہوگا تو صرف تمہارا ہوگا۔ وہ ٹیلی فون ڈائیریکٹری سے دیکھ کر کوئی اور نمبر ٹرائی کرے گا۔ تم ساری عمر روتی رہنا ایک خیالی تصویر کے لیے۔"

کلپنا تو لکچر دے کر چلی گئی۔ اور اسے نئی سوچ دے گئی۔ اس نے غور کیا تو اسے کلپنا کی باتوں میں صداقت نظر آئی۔ اور پھر کئی دن تک اس کا فون نہیں آیا۔ کالج میں کلپنا نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔ پھر امتحان شروع ہوگئے۔ اور وہ دلجمعی کے ساتھ پیپرز دینے لگی۔ بلکہ دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بات اتنے ہی پر ٹل گئی۔ اگر جمشید کا فون آتا رہتا تو اول تو اس کی پڑھائی متاثر ہوتی۔ پھر ہوسکتا ہے کہ جمشید اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اور کوئی وعدہ کرنے کے بجائے دامن بچا جاتا۔ تب اس کے لیے یہ صدمہ برداشت کرنا مشکل ہوجاتا۔

امتحان کا آخری پرچہ دے کر آئی تو دل و دماغ ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔ نہا دھو کر کھانا کھایا۔ پروگرام تھا کہ جم کر سوئے گی۔ بلکہ دو چار دن تک صرف سوئے گی اور کھائے پیے گی۔ دوسرا کوئی کام نہیں کرے گی۔ اتنے دن کی جاگ اور تھکن نے برا حال کر دیا تھا۔ اب جا کر سر سے بوجھ اترا تھا۔ پیپرز بھی اچھے ہوئے تھے۔ فرسٹ کلاس آنے کا یقین تھا۔ ابھی بستر پر لیٹے چند منٹ ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سخت کوفت ہوئی۔ یاد ہی نہیں رہا کہ فون کا پلگ نکال دیتی۔ بددلی سے ریسیور اٹھایا۔ 'ہیلو' کہہ کر دوسری طرف کی بات سنی۔ تو ساری تھکن ہوا ہوگئی۔

"پیپرز کیسے ہوئے محترمہ؟" وہی تھا۔ وہی دلنشیں لہجہ۔ وہی بے تکلفی اور اپنائیت وہ سرشار ہوگئی۔

"ٹھیک ہوئے۔ شکریہ۔"

"کیا بات ہے۔ کیا ہم سے ناراض ہیں؟"

"یہ کیسے سمجھ لیا؟"

"میرے فون نہ کرنے کا شکوہ جو نہیں کیا؟"

"کیا مجھے شکوہ کرنا چاہیے تھا؟" الٹا سوال کیا۔

"ہوں..... تو آپ سچ مچ خفا ہیں۔ کیا صفائی پیش کرنے کی اجازت ہے؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا رشتہ ہی کیا

دوہے

ظفر مرزاپوری

باہر اپنے مکان کا کمرہ لیا سجائے
من میں دکھ کی بھیڑ ہے ہونٹ مگر مسکائے

☆

بیٹی کسی غریب کی بپتا کسے سنائے
گیلی لکڑی پیڑ کی سلگ سلگ رہ جائے

☆

آندھی بجلی لے گئی سارا نگر اداس
مائی کے اک دیپ کی رین بنی ہے داس

☆

ساگر بنا جو گیان کا کچھ نہیں پایا گیان
خود کو جو پہچان لے انسان وہی مہمان

☆

آتی جاتی سانس کو دیکھ نہ پائے کوئے
ٹوٹا تانا سانس نے جگ سے رخصت ہوئے

☆

جیون چین سے کاٹ لو ظفر یہ رکھو یاد
سمے سے ٹکر مت لینا سمے بڑا استاد

digest library.com

ہے جو آپ صفائی پیش کریں۔ یا میں شکوہ کروں؟" سنجیدگی سے کہا۔

"معاملہ واقعی سیریس ہے۔ دیکھو خوشی میں اپنے باہر جانے کے انتظام میں مصروف تھا۔ تمہارے بھی اگزام ہو رہے تھے۔ اسی لیے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بس اتنی سے بات ہے۔"

"آپ باہر جا رہے ہیں؟" گھبرا کر سوال کیا۔

"ہاں.... بہتر مستقبل کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ یہاں کیا رکھا ہے؟"

"واقعی۔ یہاں کیا رکھا ہے؟" اداسی سے کہا۔

"تم اداس ہو گئیں؟" وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"نہیں تو۔ اس میں اداس ہونے والی کیا بات ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔" اس نے رسان سے کہا۔

"کیا ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟"

"پوچھیے؟"

"تم مجھے یاد رکھو گی؟"

"کس حوالہ سے۔ صرف فون پر چند باتیں کرنے سے کوئی رشتہ نہیں بنتا۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ اور میں بھی۔"

"اگر میں کہوں کہ تم سے دل کا رشتہ ہے۔ محبت کا رشتہ ہے تو۔"

"میں یقین نہیں کروں گی۔" صاف اور ٹھوس لہجہ میں کہا۔

"خوشی! تم میری اولین چاہت ہو۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا۔ میں زندگی کا سفر تمہارے ساتھ طے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اور بات کہ اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اپنی سچائی کا ثبوت دے سکوں۔ لیکن تم سے پورے حق کے ساتھ تمہاری رفاقت کی خواہش کر رہا ہوں۔ بولو۔ کیا اب بھی تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟" جمشید نے دل کھول کر رکھ دیا۔

"جمشید! آپ نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔" دھیرے سے کہا۔

"جان... اپنی ساری الجھنیں ذہن سے نکال دو۔ دو سال.... صرف دو سال کا وقت مجھے دو۔ پھر ہمیں ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میرا یقین کرو۔ میں مر جانے کی حد تک سنجیدہ ہوں۔"

"اگر اس بیچ والدین نے شادی کے لیے مجبور کیا؟"

"تم کسی صورت انہیں منا لینا۔ میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔ اگر ضروری ہوا تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ جاؤں گا۔"

"وعدہ؟"

"پکا وعدہ۔"

"جمشید میں آپ کا انتظار کروں گی۔ کیا جانے سے پہلے ہم ایک بار مل نہیں سکتے؟"

"شاید اب ممکن نہ ہو سکے۔ میں اسٹیشن کے راستے میں ہوں۔ اور گھر جا رہا ہوں۔ گھر والوں سے مل کر روانہ ہو جاؤں گا۔"

"آپ نے ایک بار بھی ملنے کی کوشش نہیں کی۔"

"بس یہی سوچا کہ تم مجھے دل پھینک اور چھچھورا نہ سمجھو ورنہ دل تو کئی بار چاہا۔ خیر انشاء اللہ ہم جلد ملیں گے۔ اور ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔ اتنا یقین کر لو کہ مجھے دیکھ کر تمہیں مایوسی نہیں ہو گی۔ اچھا خاصا ہینڈسم اور اسمارٹ بندہ ہوں۔"

"مجھے دیکھنے کو آپ کا دل نہیں چاہا؟"

"چاہا.... کئی بار چاہا... دیکھا بھی.... لیکن تصور میں۔ بہت حسین ہو تم.... اچھا... اب اجازت دو... خدا حافظ۔"

"خدا حافظ.... اپنا خیال رکھیے گا۔" آواز بھرا گئی۔

"او کے۔ سیم ٹو یو۔"

فون کٹ گیا۔ لیکن وہ کئی منٹ ریسیور تھامے بیٹھی رہی۔ پھر ہوش آیا تو فون رکھ دیا۔ اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ چلا گیا۔ ملے بغیر۔ چند وعدے تھما کر۔ چند خواب دکھا کر۔ کلپنا سچ کہتی تھی۔ لیکن اس سارے قصے میں اس کا قصور بھی کیا ہے؟ لیکن سارا قصور تو اسی کا ہے۔ کیونکہ اس نے اس کی حوصلہ افزائی کی جو بات یہاں تک پہنچی۔ پہلی یا دوسری بار ہی اسے جھڑک دیتی، فون بند کردیتی، بات ہی نہ کرتی۔ لیکن وہ تو بے وقوف بنتی رہی۔ اس کے فون کا انتظار کرتی رہی۔ اس سے باتیں کر کے خوش ہوتی رہی۔ اور اب وہ جاتے جاتے بھی اسے امید اور آس کے کھلونے تھما گیا۔

رمشہ دیر تک روتی رہی۔ اور روتے روتے ہی سوگئی۔ رزلٹ آیا۔ اس نے فرسٹ پوزیشن لے کر اپنا ریکارڈ برقرار رکھا تھا۔ پڑھائی سے جی اچاٹ ہوگیا تھا۔ لیکن خالی گھر بیٹھنے سے بھی کیا فائدہ تھا۔ سوشل سائنس میں ایم اے کرنے کا فیصلہ کرلیا داخلہ آسانی سے مل گیا۔ بس اتنا ضرور ہوا کہ کلپنا کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ اکثر اسے گھسیٹ لے جاتی تھی۔ شاپنگ کا پروگرام دوسرے چوتھے دن بن جاتا تھا۔ وہ انکار بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اتنی پیاری دوست کی شادی کے موقع، پر اسے اپنے سارے دکھ دور کر کے ہنسی خوشی حصہ لینا پڑ رہا تھا۔ وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھی کہ کلپنا سے اپنا دکھ شیئر کرسکتی۔ اس نے تو پہلے ہی انتباہ دیا تھا۔ سختی سے منع کیا تھا۔ سمجھایا بھی تھا کہ وہ یہ حماقت نہ کرے۔ لیکن وہی بے وقوف تھی۔ جو صرف باتوں ہی باتوں میں ایک انجانے شخص کو دل دے بیٹھی۔ غلطی اسی کی تھی۔ اگر وہ سچ مچ فراڈ ہوا۔ لوٹ کر نہ آیا۔ تو وہ کیا کرے گی؟

احادیث نبویؐ

☆ علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے۔

☆ وہ شخص ہم میں سے نہیں جو بڑوں کا ادب نہ کرے اور چھوٹوں پر رحم نہ کرے۔

☆ قسم کھانے سے مال بک جاتا ہے مگر برکت نہیں رہتی۔

☆ آگ سے بچو خواہ کھجور کا ایک ٹکڑا دے کر ہی سہی۔

☆ ”جس جان کا (دنیا میں) پیدا ہونا اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے وہ ضرور پیدا ہوگی۔“

(محمد کمیل، ممبئی)

”کیا بات ہے رمشہ جان! کس سوچ میں گم ہو؟“ کلپنا کئی دن سے اس کی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ اس کی بات سن کر وہ ایسے چونکی جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔

”کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں؟“ خود کو سنبھال کر مسکرائی۔

”یہ تم مسکرا رہی ہو کہ بسور رہی ہو۔“ کلپنا نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیار سے کہا۔

”اب کیا کریں۔ شکل ہی ایسی ہے کہ دیکھنے والوں کو میرے ہنستے اور بسورنے میں فرق ہی نہیں لگتا۔“ جبر کر کے کہا۔

”چلو مان لیا کہ میڈم کی شکل ہی روتی بسورتی ہے۔ لیکن اب سے پہلے یہی شکل ہنستا مسکراتا گلاب نظر آتی تھی۔ کہیں یہ اس کم بخت فون والے کا

digest library.com

کیا دھرا تو نہیں ہے؟" رازداری سے پوچھا۔
"ک.... کون فون والا؟" وہ ہکلائی۔
"ارے وہی.... جو تمہیں فون کر کے پرچاتا تھا؟"
"وہ.... وہ تو ڈانٹ کھا کر خاموش ہو گیا۔"
"یعنی سچ مچ رانگ نمبر نکلا۔ چلو شکر ہے پیچھا چھوٹا۔ میری مانو تو ایم اے کا خیال چھوڑو اور شادی کر لو۔"
"واہ۔ اپنی شادی کیا ہو رہی ہے۔ سب کی جان پھنسانے کی سوچ رہی ہو۔ مجھے تو معاف ہی کرو۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"
"کیا ٹھیک ہو۔ اچھی بھلی صحت کا ناس مار لیا ہے۔"
"اب یہ فضول باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ آج کہاں چلنا ہے؟"
"ٹیلر کے پاس جانا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ جلدی سے نکل چلو ورنہ دھوپ تیز ہو جائے گی۔"
کلپنا مان گئی۔ اسے محسوس بھی نہیں ہوا کہ رمشہ نے بڑی چالاکی سے موضوع بدلا تھا۔ ٹیلر کے پاس اس کے بھی کپڑے پڑے تھے دونوں ایک ہی ٹیلر سے کپڑے سلواتی تھیں۔
کام جلدی ختم ہو گیا۔ وہ ضد کر کے گھر پر اتر گئی۔ کلپنا نے بھی ضد نہیں کی۔ لیکن دوسرے دن گھر آنے کا وعدہ لے لیا۔ خدا جانے اس کی دعاؤں کا اثر تھا یا اس کی لگن سچی تھی کہ اس رات جمشید کا فون آ گیا۔ اسے تو اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا۔
"کیا بات ہے خوشی! تم چپ کیوں ہو؟" جمشید اس کی خاموشی محسوس کر کے بولا۔ وہ ہوش میں آ گئی۔
"وہ اچانک آپ کا فون آیا تو مجھے یقین نہیں آیا۔"
"اچھا.... اتنا بے اعتبار ہوں میں؟" شکوہ کیا۔

"اتنے دن کے بعد آپ کی آواز سنی۔ کیا بہت مصروف تھے۔" اپنی بے تابیاں چھپانے کی کوشش میں بے حال ہو گئی۔
"ہاں بھئی مصروف تھا۔ شروع شروع کی بات ہے نا۔ تو دس مسائل ہیں۔ تنہا سب کچھ فیس کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر جاب بھی تلاش کرنا پڑی۔ اس کے بغیر یہاں گذارا بھی نہیں ہو سکتا۔"
"مل گئی جاب؟"
"ہاں! اور ساتھ ہی میری مصروفیت بھی بڑھ گئی ہے۔"
"گھر والوں سے رابطہ ہے؟"
"ہے ہی کون گھر میں۔ ایک ماں ہیں۔ اور اب تم ہو۔ بس یہی دو فرد ہیں پوری دنیا میں میرے اپنے؟" رمشہ اس بات پر شاد ہو گئی۔ دھیرے سے کہا۔
"شکریہ۔"
"کس بات کا شکریہ؟"
"اپنا سمجھنے کا۔ ہاں اپنا کوئی نمبر یا ایڈرس دیں گے۔"
"آں.... ہاں... دیں گے۔ لیکن ابھی نہیں۔ دراصل کئی دوست مل کر ایک فلیٹ کرائے پر لے کر رہ رہے ہیں۔ پرائیویسی نام کی چیز نہیں ہے۔ میں خود ہی فون کروں گا۔ یہ بتاؤ رزلٹ کیا رہا؟"
"فرسٹ پوزیشن آئی ہے۔ اور اب ایم اے میں داخلہ لیا ہے۔"
"گڈ۔ یہ تم نے اچھا کیا۔ مصروفیت کے ساتھ علم میں اضافہ بھی ہو گا۔"
"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" دھیرے سے کہہ کر چپ سادھ گئی۔
"تمہارا لہجہ کچھ، بجھا بجھا سا ہے۔ کہیں اس کا سبب میں تو نہیں ہوں؟"
"کسی حد تک۔ نہ جانے کیوں اندیشے سے

پریشان رکھتے ہیں۔"

"تم سارے اندیشے جھٹک دو۔ اور مجھ پر اعتماد کرو۔"

وہ کیا کہتی خاموش رہی۔ جمشید نے شب بخیر کہہ کر فون کاٹ دیا۔ اب پھر وہی انتظار تھا۔ لامتناہی انتظار۔ خدا جانے جمشید اپنا پتہ اور فون نمبر کیوں نہیں دیتا ہے۔ کیا مصلحت ہے؟ کیا مجبوری ہے۔ وہ اگر چاہے بھی تو اس سے رابطہ نہیں کر سکتی۔ اس کے رحم وکرم پر رہ کر وقت کاٹنا کیسا مشکل ہے وہ یہ بات سمجھتا کیوں نہیں ہے۔ یا جان بوجھ کر سمجھنا نہیں چاہتا؟

کلپنا کی شادی کا سلسلہ ہوا تو دل بہل گیا۔ ساری رسموں میں شرکت کی۔ وقت بہت اچھا گزرا۔ کلپنا رخصت ہوگئی۔ اور وہ پابندی سے یونیورسٹی جانے لگی۔

ایک بار پھر خالہ جان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اس بار امی گاؤں جا کر انہیں اپنے پاس لے آئیں۔ کیونکہ بہروز باہر تھا۔ کہاں ہے نہ اس نے پوچھا۔ نہ امی نے کھل کر بتایا۔ اسے بہروز سے نہ پہلے دلچسپی تھی نہ اب فکر تھی۔ اس بار خالہ جان زیادہ ہی بیمار تھیں۔ ہفتہ بھر اسپتال میں رہ کر واپس آئیں تو اندازہ ہوا کہ مرض طول پکڑ چکا ہے۔ امی نے بہروز کو فون کر کے ان کی حالت کے متعلق بتایا۔ لیکن اس کا آنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس نے معذرت کرلی۔ اس نے سنا تو بہت غصہ آیا۔ لیکن امی نے ایک لفظ نہیں کہا۔ بلکہ اس کی حمایت کی کہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر کیسے آسکتا ہے۔ وہ بھی فرینکفرٹ سے۔ تب اسے علم ہوا کہ گاؤں کا گنوار ان دنوں ملک سے باہر ہے۔ چلو شاید اب انسان بن جائے۔ اپنی بات پر اسے خود ہی ہنسی آگئی۔

دو چار مہینے کے بعد جمشید کا فون آجاتا تھا۔ اب اس نے بھی صبر کرلیا تھا۔ اس درمیان یکے بعد دیگر

غزل

اعجاز انصاری، نئی دہلی

سحر سے قبل ہی توحید کا کلمہ سناتی ہے
ہر اک چڑیا یہ لگتا ہے کہ سورج کو جگاتی ہے
تری یادوں کا لشکر رات بھر سونے نہیں دیتا
غضب کا بوجھ پلکوں پر لیے ہر صبح آتی ہے
ہمیں معلوم ہے دستِ ہنر کب کام آتا ہے
کہ جب مفلس کے خوابوں کی حویلی ٹوٹ جاتی ہے
کبھی جو غرق کر دیتی ہے کشتی کو کنارے پر
وہی طاقت کبھی کشتی بھنور میں بھی چلاتی ہے
ندی کے دو کنارے ہیں یہ ہرگز مل نہیں سکتے
محبت صبر کرتی ہے سیاست ظلم ڈھاتی ہے
ہمیں دنیا میں کیا سب سے الگ سب سے نرالے ہیں
ہمیں کو زندگی کیوں ہر قدم پہ آزماتی ہے
کہیں کچھ بھی نہ ہو اعجاز ایسا ہو نہیں سکتا
کوئی طاقت تو ہے جو ساری دنیا کو چلاتی ہے

دو حادثے ہوگئے۔ خالہ جان کا انتقال ہوگیا۔ اور پاپا ایک حادثے میں سخت زخمی ہوگئے۔ جس کے بعد وہ ریٹائرمنٹ لے کر گھر آگئے۔ بہروز ماں کے انتقال کی خبر سن کر بھی نہیں آیا۔ اس کی سنگ دلی پر رمشہ کو بہت غصہ آیا۔ لیکن امی کے خیال سے ایک لفظ نہ کہا۔ امی کو اپنے بھانجے سے انس بھی بہت تھا۔ اور اب خالہ جان کے بعد تو وہ اس کی ماں بن کر اس سے کچھ زیادہ ہی ممتا جتانے لگی تھیں۔

پاپا اب چھڑی کے سہارے چلتے تھے۔ ایک پیر کے آپریشن کے بعد خامی پیدا ہوگئی تھی۔ مقامی ملٹری

digest-library.com

کالج میں انہیں جاب مل گئی تھی۔ جہاں وہ ہفتہ میں تین دن جاتے تھے۔ باقی وقت لائبریری میں گذارتے تھے یا پھر صبح شام اپنے لان کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ کئی بار انہوں نے رمشہ کی شادی کا تذکرہ چھیڑا۔ لیکن امی نے ٹال دیا۔ بلکہ کئی اچھے رشتے آئے تب بھی انہوں نے دلچسپی نہیں لی۔ ایک دن پاپا نے بہت سختی سے ان سے جواب طلب کیا۔ تب انہوں نے راز کھولا۔

"میں نے آپا جان کو زبان دی ہے۔ رمشہ کی شادی بہروز سے ہی ہوگی۔"

"یہ بات تم پہلے ہی بتا سکتی تھیں۔" پاپا نے ناراضگی سے کہا۔

"مجھے بہروز کی واپسی کا انتظار ہے۔" امی نے بات ختم کی۔

"لیکن رمشہ کی مرضی بھی تو معلوم کرو۔"

"وہ اب گاؤں کا سیدھا سادا گنوار لڑکا نہیں ہے۔ جو رمشہ کو انکار ہوگا۔ تب کی بات اور تھی۔"

پاپا کو ان کی بات سے متفق ہونا پڑا۔ یہ بات دانیال نے بہن سے بتادی۔ اسے سخت غصہ آیا۔ سوچا جب اس کا موقع آئے گا۔ وہ صاف انکار کر دے گی۔ اب جو حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ عرصہ سے جمشید نے فون نہیں کیا۔ یہی کوئی چھ سات مہینے ہوئے ہوں گے۔ اور اگر امی پاپا نے انکار کی وجہ پوچھی۔ تو وہ کیا جواب دے گی؟ کس کا نام لے گی؟ اور اگر اس نے ہمت کر کے بتا بھی دیا تو اس کا اتہ پتہ کیا بتائے گی؟ اف کیسی حماقت کی ہے اس نے ان دیکھے ان جانے شخص کو دل کا روگ بنا لیا ہے۔ اور اپنی محبت اور وفائیں اس کے نام کر کے بیٹھ گئی ہے۔ لیکن ماں باپ کیوں اس کی حماقت کی تائید کریں گے؟" اور کیوں اس کا ساتھ دیں گے؟ جمشید کی خاموشی نے اسے دلگرفتہ کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ مایوسیاں تھیں اور انتظار کی کوفت تھی۔ بہروز اکثر امی کو فون کرتا تھا۔ اتفاق سے دو ایک بار اسی نے فون اٹھایا۔ اور بات کئے بغیر جھٹ امی کو بلا کر ریسیور تھما دیا۔ وہ دن رات دعائیں مانگتی رہی کہ جمشید کا فون آجائے۔ اور اسے وہ آنے والے خطرات سے آگاہ کر سکے لیکن شاید دعاؤں کی قبولیت کے سارے در بند ہو چکے تھے۔ یا پھر اسی کی دعاؤں میں اثر نہیں رہا تھا۔ ایم اے فائنل اگزام سر پر تھے۔ اس لیے وہ ساری باتیں بھلا کر پڑھائی میں مصروف ہوگئی۔

امتحان ختم ہوا۔ ذرا سا سکون ملا۔ انہیں دنوں کلپنا گھر آگئی۔ اس کی گود میں پیاری سی گڑیا بھی تھی۔ ابھے نہیں آسکا تھا۔ وہ کناڈا جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ اور کلپنا بھی گھر والوں سے ملنے ہی آئی تھی۔ وہ اپنی سہیلی سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ لیکن کلپنا نے اس کی اچھی خاصی کلاس لے لی۔

"یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ رنگ روپ، شوخی، زندہ دلی سب کہاں رہن رکھ دی۔ بس پڑھ چکیں۔ شرافت سے شادی کر کے گھر بساؤ۔ آئینہ دیکھو۔ چالیس سال کی لگنے لگی ہو۔"

وہ ہنسنے لگی۔ کلپنا کو بہلانا بھی مقصود تھا۔

"عمر زیادہ ہو جائے تو رنگ روپ بھی ماند پڑ جاتا ہے۔"

"ہاں ضرور بڑی اماں۔ اچھا فضول باتیں نہ کرو۔ سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟" کلپنا نے رازداری سے پوچھا۔

"اف اوہ۔ بات کیا ہوگی۔ آرام سے کھاتی ہوں ٹھاٹ سے جی رہی ہوں۔ نہ کوئی فکر نہ پریشانی۔ ابھی امتحان دے کر فارغ ہوئی ہوں۔ چار دن میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"چلو مان لیا۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

"اچھی سی سروس کروں گی؟ پاپا کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ دانیال کی تعلیم پوری ہو جائے۔ وہ کہیں نوکر ہو جائے تب جا کر اطمینان ہوگا۔"

"یعنی شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟" کلپنا خفا ہوگئی۔

"یہ شعبہ امی اور پاپا کا ہے۔ انہیں کو سوچنا ہے۔"

"تمہاری مرضی کے بغیر وہ بھی کیا کریں گے؟"

"میں نے کب انہیں منع کیا ہے؟" ایک دم اچھی بچی بن کر کہا۔

"کیا تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ آنٹی اور انکل کو تمہاری شادی کا خیال نہیں ہے؟ میں نہیں مان سکتی۔"

"انہیں بہروز کا انتظار ہے۔ لیکن میں بہروز سے شادی نہیں کروں گی۔"

"کیوں نہیں کرو گی؟ اس میں کیا برائی ہے؟"

"میں اسے پسند نہیں کرتی۔ یہی برائی کیا کم ہے؟"

"ناپسند کرنے کی وجہ؟"

"کچھ نہیں.... بس دل اس کی طرف مائل نہیں ہوتا۔"

"شادی کے بعد مائل ہو جائے گا۔ کسی اجنبی کے ساتھ ہوتی ہے تو لڑکیاں اس سے پیار کرنے لگتی ہیں۔ بہروز تو دیکھا بھالا ہے۔ اور اب تو وہ گاؤں کا گنوار بھی نہیں رہا۔"

"تم یہ بات نہیں سمجھو گی؟" اس نے بے بسی سے کہا۔

"کہیں اس رانگ نمبر کا تو کچھ چکر نہیں ہے؟" کلپنا نے چھیڑا۔ رمشہ کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ "ہا۔ کمبخت کیسی دور کی کوڑی لائی ہے شادی کے بعد اور تیز ہوگئی۔" دل میں کہا۔ پھر خود کو سنبھال کر بولی۔

"تم بھی کس کی بات کرتی ہو۔ جس کا نہ نام معلوم۔ نہ پتہ۔ اگر ایسا ہی میرا دماغ خراب ہوتا تو بہروز کیا برا تھا۔ دیکھا بھالا اور سمجھا بوجھا بندہ ہے۔"

اپنی دانست میں اس نے کلپنا کو قائل کیا۔ اور بات اتنی واضح تھی کہ کلپنا کو بھی یقین آ گیا۔ ہنس کر چٹکی لی۔

"میں تو مذاق کر رہی تھی۔ کیا میں جانتی نہیں ہوں کہ تم اتنی نادان نہیں ہو۔ یہ تو ہوا کو مٹھی میں بند کرنے والی بات ہوگی۔"

"شکریہ۔ ایک تم ہی تو ہو جو مجھ کو سمجھتی ہو۔"

"ابھے کا ایک دوست ہے۔ اگر تم کہو تو وہاں بات چلائیں۔ ڈاکٹر ہے۔ اپنا کلینک ہے۔ زمین جائیداد بھی ہے۔ اور پھر اکیلا لڑکا ہے۔ ماں باپ بوڑھے ہیں وہ گاؤں میں رہتے ہیں۔ نام ہے ریاض حق۔"

"ابھی تم اس ذکر کو رہنے دو۔ جب میں کہوں

بسم اللہ کی برکتیں

☆ بسم اللہ ایک ایسا کلمہ ہے جس سے منہ میں خوشبو پیدا ہو جائے۔

☆ بسم اللہ ایک ایسا بول ہے جس کی موجودگی میں کوئی غم باقی نہیں رہتا۔

☆ اس سے آفات اور مصائب دور ہوتے ہیں یہ وہ کلمہ ہے جس کے پڑھنے سے عذاب ہٹا دیا جاتا ہے۔

☆ جو شخص بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ورد کرتا ہے شیطان اس سے بھاگتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ جل شانہ کی نوازش ہے۔

☆ اور سدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر اپنے محبوب کی یاد کو تازہ کرتا رہتا ہے۔

digest library.com

تب امی سے بات کرنا۔ فی الحال میں شادی کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"موڈ کی بھی خوب کہی۔ شادی ایسا کام نہیں ہے جس کے لیے موڈ دیکھا جائے۔ یہ کوئی عام سا کام نہیں ہے کہ ابھی موڈ نہیں ہے تو نہیں کروگی۔ یہ شادی ہے۔ ایک اہم فرض ایک نہایت ضروری فیصلہ جس سے تمہاری زندگی اور مستقبل جڑا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں۔ تمہاری بات سے انکار بھی نہیں ہے۔ بس مجھے کچھ وقت چاہیے ہے۔ تاکہ ذہنی طور پر نئی زندگی کے لیے تیار ہوسکوں۔ زبردستی خود پر کسی کو مسلط کرنا بھی تو مناسب نہیں ہے۔"

"خیر۔ جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہ کرنا۔"

"اچھا آپا جان!" رمشہ نے اس کی بات ہنسی میں اڑا دی۔ کلپنا اس سے رخصت ہوکر چلی گئی۔

جس روز کلپنا ممبئی جارہی تھی وہ اسے خودالوداع کہنے اسٹیشن گئی۔ ممبئی میں ابھے اس کا منتظر تھا۔ وہیں سے اسے کناڈا کی فلائیٹ لینا تھی۔ سامان وہ پہلے ہی کارگو سے بھیج چکے تھے۔ کلپنا سے گلے مل کر وہ بہت روئی۔ اتنی پیاری دوست کی جدائی کا خیال تڑپا رہا تھا۔

کچھ یہ بھی خیال تھا کہ اب وہ بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ ماں باپ کی محبت اور دوست کی رفاقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ماں باپ سے دل کی بات نہیں کی جاسکتی۔ اور دوست سے اچھے برے وقت میں دل کی بات کی جاسکتی ہے۔ حالانکہ اس نے کلپنا سے بھی دل کی بات نہیں کی تھی۔ رانگ نمبر واقعی رانگ نمبر ثابت ہوا تھا۔ اور اس نے کلپنا کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تا۔ اس کے کریدنے کے باوجود ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ لیکن یہ سہارا تو تھا کہ وہ اپنی پیاری سہیلی سے اپنا دکھ درد شیئر کرسکتی ہے۔ مشورہ کرسکتی ہے۔

اب وہ سہارا بھی ختم ہوگیا تھا۔ کلپنا نے چلتے چلتے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے فون کرتی رہے گی۔ اور اپنا ایڈرس اور فون نمبر بھی سیٹل ہونے کے بعد دے گی۔

کلپنا چلی گئی اور وہ اتنی بڑی دنیا میں تنہا رہ گئی۔ فون کی گھنٹی اب بھی بجتی تھی۔ لیکن اس بیدرد نے تو گویا اسے بالکل بھلا دیا تھا۔ دل کے تار اب بھی بجتے تھے۔ لیکن ان تاروں سے درد بھری لے کے سوا کوئی نغمہ نہیں پھوٹتا تھا۔

اسے ایک کالج میں لکچرر شپ مل گئی تو زندگی کو مصروفیت کا جواز بھی مل گیا۔ انہیں دنوں بہروز واپس بھی آگیا۔ گاؤں میں اس کا تھا ہی کون جو وہ وہاں رہتا۔ امی اور پاپا نے بصد اصرار اسے اپنے پاس ٹھہرایا۔ صرف چند ہفتہ کی بات تھی۔ پھر اسے اپنی جاب پر چلا جانا تھا۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اسے بڑا اچھا عہدہ آفر ہوا تھا۔ یہ کمپنی امریکہ اور ہندوستان کے تعاون سے قائم ہوئی تھی۔ اور اس کی قابلیت کے عین مطابق اسے جاب ملی تھی۔ پاپا نے اس کی جاب پر اظہار مسرت کیا تھا۔

بہروز اب وہ پہلے والا بہروز نہیں رہا تھا۔ اس کی پرسنالٹی میں زبردست تبدیلی آئی تھی۔ بے حد اسمارٹ اور وجیہہ ہونے کے علاوہ انتہائی سوبر اور ویل ڈریسڈ ہوگیا تھا۔ اس سے رسمی سلام دعا ہوئی۔ دو ایک باتیں بھی ہوئیں۔ اور پھر وہ پونے چلا گیا۔ بہروز کے جانے کے بعد ایک دن امی نے اسے اپنے پاس بلا کر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"رمشہ بیٹی! ہم چاہتے ہیں کہ جلد ہی تمہارے فرض سے سبکدوش ہوجائیں۔ میں نے آپا جان کو زبان دی تھی کہ تمہاری شادی بہروز سے ہی ہوگی۔ اور اب تمہارے پاپا کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ انہیں بہروز بہت پسند ہے۔"

"امی! میں نے بہروز کے بارے میں اس

طرح کبھی نہیں سوچا۔"

"یہ کوئی عذر نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی اہمیت ہے۔ کیا تم نے کسی اور کے متعلق کبھی سوچا ہے؟ اگر ہاں... تو ہمیں بتاؤ... اور اگر نہیں میں تمہارا جواب ہے تو تم کو بہروز سے شادی کرنے پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ ماشاء اللہ ہزاروں میں ایک ہے۔"

"مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیجیے۔" دلگرفتگی سے اتنا ہی کہہ سکی۔

"یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ دراصل ہمارے سامنے اس سے بہتر کوئی اور رشتہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے ہماری خواہش ہے کہ تم ادھر ادھر کی باتوں میں اپنا ذہن پراگندہ نہ کرو۔"

"وہ خاموشی سے چلی گئی۔ کئی دن ماں کی باتوں پر غور کرنے کے بعد بھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی تو سوچا کہ شاید والدین کی خوشی پوری کرنے کا صلہ قلبی سکون کی صورت میں میسر آجائے۔ اور تب اس نے ماں کو اپنی رضامندی دے دی۔ جمشید کا آسرا ٹوٹ چکا تھا۔

ایک دن بہروز کا فون آگیا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ امی نے ریسیور اسے تھما دیا۔ اور خود وہاں سے چلی گئیں۔

"ہیلو۔ کیا آپ رمشہ ہیں؟" بہروز نے پوچھا۔

"جی..... جی ہاں۔" اس نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔ بہروز نے کہا۔

"میں نے مناسب سمجھا کہ براہ راست آپ سے گفتگو کروں۔ اور تب کوئی فیصلہ کروں۔ دیکھیں رمشہ میں جس ملک میں رہ کر آیا ہوں۔ وہاں بزرگوں کے فیصلوں کا احترام کرنے کا چلن نہیں ہے۔ معاشرہ کی یہ آزاد خیالی مجھے پسند ہے۔ شادی بیاہ کا معاملہ ہو، تعلیم کا مسئلہ ہو۔ یا کیریئر کے انتخاب کا سوال ہو۔ والدین بچوں پر اپنے فیصلے اور اپنی پسند مسلط نہیں کرتے۔ اکثر و بیشتر بچوں سے فیصلہ کرنے میں غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ جس کے نتائج بھی خوش گوار نہیں ہوتے۔ تاہم کوئی کسی کو الزام نہیں دے سکتا۔ ہمارے ہاں ابھی تک اتنی آزاد خیالی تو نہیں آئی ہے لیکن کچھ تبدیلی ضرور آئی ہے۔ کم از کم اس حد تک ضرور والدین کشادہ دل ہو چکے ہیں۔ کہ اولاد کی خواہش کا احترام کریں۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟" اس کی خاموشی محسوس کر کے پوچھا۔

"جی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"میری امی اور آپ کی امی نے جو بھی فیصلہ کیا ہو۔ کم از کم میں آپ کو ان کے فیصلے کا پابند نہیں سمجھتا۔

غزل

علقمہ شبلی

دیکھتے جاؤ، ذرا بے چارگی
قسمت انساں ہوئی بے چہرگی
ہر قدم پر ہے بس اب ژولیدگی
کھو گئی ہے تو کہاں سنجیدگی
زیست سے ہے بس تعلق اس قدر
آشنائی ہے نہ ہے بے گانگی
کج کلاہانہ وہ آیا بزم میں
تاکتی منہ رہ گئی شائستگی
شمع صورت رات دن جلتا رہوں
کر گئی احسان مجھ پر زندگی
آئینہ رنگوں کو دکھلاتی رہی
باغ میں اک سیم تن کی سادگی
مجھ کو دلینا کیا چراغ راہ سے
کم نہیں کچھ شوق کی تابندگی

مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ اس رشتہ پر راضی ہیں؟"

"آپ کو صحیح بتایا گیا ہے؟" آہستہ سے کہا۔

"کوئی مجبوری۔ یا بڑوں کے حکم ان کی خواہش پر اپنی مرضی کے خلاف تو آپ نے رضا مندی نہیں دی ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ ہوسکتا ہے میں آپ کی توقعات پر پوری نہ اتروں؟"

"یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا اطلاق میرے اوپر بھی ہوتا ہے۔ یعنی میں بھی.... خیر.... ہم کوشش تو کر سکتے ہیں کہ ایک دوسرے کی خوشی کا احترام کریں۔ اور دل آزاری کا سبب نہ بنیں؟"

"جی.... میں اس کا پورا خیال رکھوں گی۔"

"شکریہ.... میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" بہروز نے فون کاٹ دیا۔

امی نے اسے مارکیٹ کے کئی کام بتا دیے تھے۔ وہ روز روز شاپنگ کی دردسری مول نہیں لے سکتی تھیں۔ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود اسے امی کی زحمت کے خیال سے بازار جانا پڑا۔ جیولر کے ہاں سے اسے تیار شدہ سیٹ لینا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم بیٹھی تھی۔ چمن بھائی نے بڑی عاجزی سے درخواست کی تھی کہ دس پندرہ منٹ میں اس کا سیٹ کاریگر لے آئے گا۔ مجبوراً وہ انتظار کر رہی تھی۔ تقریباً ہر کاؤنٹر پر عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ وہ کنارے ایک صوفہ پر بیٹھی تھی۔ یکا یک کسی نے جمی کہہ کر کسی کو مخاطب کیا۔ وہ چونک گئی۔ کچھ معمر لوگ تھے۔ اور کئی نوجوان جوڑے ان میں جمی کون ہے۔ وہ پوری طرح متوجہ ہوگئی۔ اور متجسس نظروں سے ایک ایک چہرہ دیکھنے لگی۔ اور پھر ایک بے حد اسمارٹ مرد پر اس کی نظر مرکوز ہوگئی۔ جو اپنی ساتھی لڑکی سے ہنس ہنس کا باتیں کر رہا تھا۔ ایک لاکٹ لڑکی کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ بار بار اسے اپنی گردن سے لگا کر دیکھ رہی تھی۔

"لاؤ میں پہنا دوں۔" مرد نے بڑی چاہت سے کہا۔

"شکریہ.... لیکن یہ بتا دوں.... پہننے کے بعد میں اسے اتاروں گی نہیں۔" لڑکی نے بہت ناز سے اپنی نازک گردن اس کی طرف بڑھا دی۔

"میڈم.... یہ سو فیصدی آپ کے لیے ہی بنا ہے؟" سیلز مین نے دونوں کی نوک جھونک سن کر دانت نکال دیے۔

"صاحب! اس کا کیش میمو بنواؤں۔" جلدی سے سیلز مین نے پوچھا۔

"یس.... بالکل بنواؤ۔" نوجوان ہنس کر بولا۔

"ارے یہ جمی پھر کہیں چلا گیا؟" لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا اور اٹھ کر ایک بچے کا ہاتھ تھام کر لے آئی۔" ماسٹر جمی اپنے پاپا کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی بیتابی پر شرمندگی محسوس کی۔ اتنے میں چمن بھائی نے اسے مخاطب کیا۔

"یہ لیجیے۔ آپ کا سیٹ آگیا۔ دیکھ لیجیے۔"

اس نے کاؤنٹر پر جا کر بے دلی سے سیٹ پر ایک نظر ڈالی۔ اور اوکے کر دیا۔ چمن بھائی نے سیٹ کا ڈبہ اچھی طرح پیک کر کے ایک خوبصورت پرس نما بیگ میں رکھا اور اس کے حوالے کر دیا۔

"باقی سامان اگلے ہفتہ تک تیار ہو جائے گا۔" چمن بھائی نے وعدہ کیا۔

"جی اچھا۔" وہ اس کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آئی۔"

"کیا وہ آج بھی جمی کی منتظر ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"شاید ہاں۔" دل نے ٹھنڈی سانس کے ساتھ

جواب دیا۔اس نے باقی کام دوسرے وقت کے لیے اٹھا کر رکھے۔ اور آٹو رکشہ لے کر گھر واپس آگئی۔ جس بے دلی سے وہ شادی کے لیے خریداری کر رہی تھی۔اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا فیصلہ صرف والدین کی خوشی پوری کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ابھی جس طرح وہ جمی کے نام پر چونکی تھی یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ جمی آج بھی اس کے دل کے ایک چور خانہ میں چھپا بیٹھا ہے۔اور شاید وہ اسے کبھی نکال بھی نہ سکے۔

"بہروز کے ساتھ منافقت بھری زندگی گزارنا آسان نہیں تھا۔اب وہ امی اور پاپا سے یہ تو کہہ نہیں سکتی تھی کہ وہ کسی اجنبی کے نام پر زندگی گزار دے گی۔اور جب شادی کرنا ہی تھی۔تو والدین کی خوشی پوری کرنا ہی مناسب تھا۔اس کے لیے بہروز اور کسی دوسرے شخص میں کوئی فرق نہیں تھا۔ پھر چاہنے والے ماں باپ کی خواہش اور خوشی کے مطابق بہروز کو شریک زندگی بنانے میں کیا برائی تھی۔دنیا تو برباد ہو ہی چکی تھی۔شاید اس طرح عقبےٰ ہی سدھر جائے۔ خدائے پاک نے ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہونے کی بشارت یوں ہی تو نہیں دی ہے اس میں بھی اس کی مصلحت ہوگی۔اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑتی ہوئی ماں کے پاس جائے اور ان کے قدموں پر سر رکھ کر کہے۔"امی! میں اپنی دنیا برباد کر کے آپ کی جنت کی چھاؤں میں آگئی ہوں۔ مجھے اپنے سینے سے لگا لیجیے۔" یہ سوچ کر ہی اس پر رقت طاری ہوگئی۔اس کا چہرہ آنسوؤں میں ڈوب گیا۔اور جب دل ذرا ٹھہرا تو اس نے وضو کر کے نماز کی نیت باندھ لی۔آہ کتنا سکون ملتا ہے۔اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو کر۔یہ طمانیت اور سکون اس کا مظہر تھا۔

شادی کے بعد وہ بہروز کے ساتھ پونے آگئی۔ کمپنی کی طرف سے ملا ہوا شاندار بنگلہ، شوفر، مالی، بیرے، خانساماں، اور بہروز کا اعلیٰ عہدہ۔ گویا ایک کامیاب و کامران زندگی کے کل لوازمات سے آراستہ ایک نئی دنیا۔ وہ کولمبس نہیں تھی اگر ہوتی تو جمشید کو تلاش کر لیتی۔ لیکن جو خود کھو گیا ہو اس کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔جو قریب تھا۔ جسے شرعاً اور قانوناً اس کا مجازی خدا بنایا گیا تھا۔ جسے اس نے قرآن پاک کی آیتوں کے ورد کے ساتھ خدا کا حاضر ناظر جان کر قبول کیا تھا اب وہی اس کے جسم و جان کا مالک تھا۔ وہ جس طرح چاہتا اس کو برتتا۔ جیسے چاہتا اپنا حق

غزل

قاضی محمود الحسن بیخود، چاند پور

جو قلب سے نخوت کو نکلنے نہیں دیتے
وہ لوگ غریبوں کو سنبھلنے نہیں دیتے

آشوبِ وطن اور میرے گھر کے مسائل
افکار کا سورج کبھی ڈھلنے نہیں دیتے

فرسودا خیالات کے حامل ہیں جو انساں
وہ کہنہ رسومات بدلنے نہیں دیتے

جو درس، مساوات کا دیتے نہیں تھکتے
خاشاکِ تعصب کو وہ جلنے نہیں دیتے

حالاتِ وطن خنجر ارباب تشدد
بے خوف ہمیں گھر سے نکلنے نہیں دیتے

اردو کی محبت میں جو کھولیں ہیں زبانیں
اردو کا وہ سکہ مگر چلنے نہیں دیتے

احباب نے بخشا مجھے تعمیر کا جذبہ
تخریب کا رستہ کبھی چلنے نہیں دیتے

بیخود کو یہ دیکھا کہ وہ سامان طرب پر
بچوں کو طرح دل کو مچلنے نہیں دیتے

digest library.com

استعمال کرتا۔ وہ انکار کی مجاز نہیں تھی۔ نہ ہی اس نے کسی بات سے انکار کیا۔ وہ اس کے لیے لباس منتخب کرتا۔ اپنے ساتھ پارٹیوں میں لے جاتا۔ اپنی پسند سے اس کے لیے شاپنگ کرتا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے جانا سنوارتا۔ ملکوں ملکوں اسے اپنے ساتھ لیے گھومتا رہتا۔ نئے نئے لوگ نئے مقامات اور جگ مگ کرتی سوسائٹی کے کھلے ہوئے آزاد ماحول میں اسے ایسے چھوڑ دیتا، جیسے تالاب سے نکال کر کسی مچھلی کو سمندر میں اتار دیا جائے۔ یہ بے کنار سمندر ایسے ایسے عجائبات سے مملو تھا کہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ لیکن اس کی آنکھیں تو بند تھیں۔ سماعتوں میں ایک آواز کے سوا ہر آواز معدوم ہو چکی تھی۔ اسے تو بہروز کی آواز بھی کم کم سنائی دیتی تھی۔ تب ہی تو اس سے غلطیاں سرزد ہوتی تھیں۔ وہ کہتا سفید قمیض نکال دو۔ وہ اسے نیلی ٹائی تھما دیتی۔ بہروز ہنس پڑتا اور الماری سے خود ہی مطلوبہ قمیض نکال کر پہن لیتا۔ وہ کہتا شام کو تیار رہنا فلاں صاحب کی پارٹی میں چلنا ہے اور جب وہ آتا تو وہ سوتی ہوئی ملتی۔ بہروز کو اس پر غصہ نہیں آتا تھا۔ پیار آجاتا تھا۔

اس کی خودسری، بے اعتنائی اور نفرت کبھی کی ختم ہو چکی تھی اب تو ویسے بھی وہ پہلے والی رمشہ ہی نہیں تھی۔ معصوم، بھولی بھالی، اس کی ہر بات کو گردن جھکا کر مان لینے والی۔ اس نے تو جیسے اس کی مرضی اور پسند کو اپنا ایمان بنا لیا تھا۔ اسے یہی کچھ تو چاہیے تھا۔ رات میں ایک بستر پر پاس پاس لیٹے ہوئے وہ بالکل اپنی سی محسوس ہوتی۔ وہ اس کے کانوں میں پیار بھری سرگوشی کرتا۔ نہ وہ اس کی باتوں کا برا مانتی، نہ کسی حرکت پر احتجاج کرتی۔ موم کی گڑیا کی طرح اس کی پسند اور رضا پر عمل کرتی۔ وہ اس کی نفرت اور غصہ بلکہ عتاب برداشت کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ لیکن وہ ایسے ملی جیسے افق پر زمین و آسمان ملتے ہیں۔

وہ یہ بھول گیا تھا کہ یہ ملنا دراصل نظر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ وہ تو اس وقت بھی اتنے ہی فاصلے پر ہوتے ہیں۔ جیسے اپنے پاس نظر آنے والی زمین آسمان سے دور ہوتی ہے۔ لیکن شاید وہ جان بوجھ کر انجان رہنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ جسے اس نے چاہا وہ اس کی اپنی ہے۔ سدا کے لیے اسے اپنا کر اس نے ایک جگ جیت لیا تھا۔ اس نے تو یہ بھی جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس کا دل جو گداز ہوا۔ اس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ اس سے اپنا آپ چھپاتی بھی نہیں تھی۔ اور پورا دکھاتی بھی نہیں تھی۔ یا بہروز کے پاس وہ دیدہ بینا ہی نہیں تھی جو اس کے اندرون کو جھانک کر اس کی روح کی گہرائیوں تک کی تھاہ لا سکتا۔ وہ مطمئن تھا۔ بس اتنا بہت تھا وہ فاتح تھا۔ لیکن اپنی کسی حرکت۔ رویے اور لفظ سے اپنے فاتح ہونے کا اعلان یا اظہار نہیں کرتا تھا۔ الفاظ کے پتھروں سے اس کی انا کا بت پاش پاش نہیں کرتا تھا۔ وہ تو اس طرح اس کے ساتھ پیش آتا تھا۔ جیسے وہ نرم و نازک کومل کومل پھول ہو۔ اور وہ اس کا محافظ۔ نگراں اور سرپرست جسے ہر دم یہ خیال رہتا تھا کہ اس پھول کو گرم ہواؤں سے کس طرح بچانا ہے۔ کب اسے چھاؤں میں رکھنا ہے۔ کب نرم نرم دھوپ میں۔ دھوپ اور چھاؤں کے اس کھیل میں وہ اس سے پورا تعاون کرتی تھی۔ کیونکہ وہ اس کا مجازی خدا تھا۔

رمشہ نے پہلی بیٹی کو جنم دیا۔ گلابی نرم و نازک سی یہ کلی اس کے جسم کا ہی حصہ تھی جسے اس نے اپنے خون سے پرورش کیا تھا۔ جب اس نے پہلی بار اسے اپنی آغوش میں لیا تو اس کے لبوں کو نہیں چوما۔ اس کی پیشانی کو بوسہ نہیں دیا۔ اس کے کان پر اپنے ہونٹ رکھ کر سرگوشی کی۔

"میری جان! میری دعا ہے کہ تیری زندگی میں کبھی کوئی جمی نہ آئے۔ اور تجھے بہروز جیسا چاہنے والا

شریک حیات ملے جسے تو پوری ایمانداری سے بھرپور چاہت اور وفاؤں کا تحفہ دے سکے۔" اپنی ماں کی طرح منافقت بھری زندگی تیرا مقدر نہ بنے۔"

بہروز نے اس ننھی رمشہ کو اپنے کلیجے میں بھر کر اس سے کہا۔

"یہ ہماری محبت کا وہ نایاب موتی ہے جسے دنیا کے سرد و گرم سے محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہی نہیں۔ ہمارا ایمان بھی ہے۔"

اس نے تائید میں گردن ہلا دی۔ اس نے اسے یہ نہیں بتایا کہ ایک دعا اس نے بھی مانگی ہے۔ اس دعا میں اس کے لیے تعریف و توصیف کے کئی نایاب اور سچے موتی بھی چھپائے ہیں۔ اگر وہ بتا دیتی تو بہروز اسے اپنی بانہوں میں بھر لیتا۔ اور چاہت کے انمول خزانے اس پر نچھاور کر دیتا۔ لیکن اس کی دعا کا پہلا حصہ جو دعا کا اصل اور اہم جز تھا۔ اس کو تمام عمر اس کا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ یہ وہ راز تھا جسے اس نے بہروز سے ہی نہیں اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہا تھا۔ لیکن چھپا نہیں پائی تھی۔ کبھی کبھی یہ راز ایک درد، ایک کسک بن کر اس کے وجود کو سراپا درد و کسک بنا دیتا تھا۔ جسے وہ دنیاوی مصروفیات کے پردے میں چھپا ڈالتی تھی۔ ان دنوں وہ بہروز کے ساتھ نیو جرسی میں تھی۔ دن میں بہروز کمپنی کے کام میں مصروف رہتا۔ وہ ہوٹل کے آرام دہ کمرہ میں ننھی سفینہ کے ساتھ آرام و سکون سے وقت گزارتی۔ شام کو بہروز اسے باہر لے جاتا۔ اس رات کلب میں پارٹی تھی۔ یہ پارٹی اس کی کمپنی کے طرف سے دی گئی تھی۔ ہر طرف مغربی رنگ نظر آ رہا تھا۔ ان کے درمیان کہیں کہیں پر ایک جھلک مشرق کی بھی نظر آ جاتی تھی۔ وہ سفینہ کی انگلی تھامے ایک گوشے کی سمت بڑھ رہی تھی۔ کہ اپنی پشت پر ایک آواز سن کر ٹھٹھک گئی۔

"جمشید! ایک ڈرنک کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

> ☆ جھوٹ بولنے سے ہر برائی کی ابتداء ہوتی ہے۔
>
> ☆ معافی اچھا انتقام ہے۔

اس نے دھیرے دھیرے گردن موڑی۔ چار کرسیوں والی ٹیبل پر وہ شخص بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اور اس کو ڈرنک کی دعوت دینے والی بڑے اشتیاق سے اس سے پوچھ رہی تھی۔ وہ سراپا دعوت بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ لب اسٹک سے لتھڑے ہوئے ہونٹوں شہد آگیں مسکراہٹ تھی۔ عریاں باہیں چمکیلے خنجروں کی مانند اس شخص پر حملہ کرنے کے لیے بیتاب تھیں۔ جب کہ اس کا مخاطب ماحول سے بے نیاز تھا۔ اسے نہ ڈرنک سے رغبت تھی۔ نہ خنجروں کا خوف اس نے نفی میں سر ہلایا۔ تو عورت کھسیا کر آگے بڑھ گئی۔ اس کی دعوت نامنظور ہو گئی تھی۔ بے حد اسمارٹ اور خوبرو وہ شخص اپنی ذات میں گم تھا۔ اس کا وجیہہ سراپا اعلان کر رہا تھا کہ اسے جمشید کے سوا کسی اور نام سے مخاطب نہیں کیا جا سکتا تھا وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں اس کی طرف بڑھی اور اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ براؤن گھنے بالوں سے بھرا ہو سر کانوں کے قریب بالوں میں سفیدی کی چمک، گھنی مونچھوں تلے بھنچے ہوئے ہونٹ۔ گہری کالی جھیل جیسی آنکھیں۔ وہ شاید اس کی محویت اور دیوانگی سے متاثر ہوا تھا۔ رمشہ کے لبوں سے ایک سرگوشی ابھری۔

"آپ..... جمشید؟؟"

وہ بہت اخلاق سے اسے تعظیم دینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"تشریف رکھیے خاتون۔" مہذب انداز، باوقار سراپا۔ سرتاپا جمشید.... بالکل جمشید.. اور وہی آواز...

digest.library.com

بالکل وہی۔"

وہ سحر زدہ سی بیٹھ گئی۔ سفینہ اس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ جو ماں کے ساتھ خود ہی چلی آئی تھی۔ اور ماں اس کی ذات سے بے خبر ایک اجنبی کی گہری جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب چکی تھی۔

"آپ کیا لیں گی۔" اس باوقار مرد نے مشرقی حسن کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔ اور ایک اچھے میزبان کا فرض ادا کیا۔

"آپ جمشید ہے نا؟" سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"جی....اور آپ۔"

"میں....میں...رمشہ....نہیں...نہیں....خوشی..." وہ ہکلائی گڑبڑا کر وہ نام بتایا۔ جو اسے جمشید نے دیا تھا۔

"تو آپ کا نام خوشی ہے۔ یہ نام آپ کے اوپر خوب سجتا ہے۔ آپ کی رفاقت ہی خوشی کی ضامن ہے۔"

"آپ.....آپ خوشی کو نہیں جانتے؟"

"جانتا ہوں۔ بلکہ خوشی کی تلاش میں ہی مارا مارا پھر رہا ہوں۔ مجھے مغربی حسن سے نفرت ہے۔ عریاں بدن دیکھ کر مجھے متلی ہوتی ہے۔ میں تو مشرقی حسن کا دلدارہ ہوں۔ آپ جیسی سرتاپا مشرقی حسن کی مالک۔ لڑکیاں مجھے اپیل کرتی ہیں۔"

"آپ....آپ....وہ فون....؟؟" اس کی لرزتی ہوئی آواز نے ایک حوالہ دے کر اسے ماضی میں لے جانا چاہا۔ لیکن وہ شاید حال میں یقین رکھتا تھا۔ اس کی بات ان سنی کر کے جذبات سے بوجھل آواز میں بولا۔

"لباس کی تہوں میں پرت در پرت چھپا حسن اپنی رونمائی کے لمحات میں جب بادلوں کے عقب سے جھانکنے والے چاند کی طرح سامنے ہوتا ہے

....تو...."

"جی....؟؟" وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔

"سوری...میں غلط فہمی کا شکار ہوگئی تھی۔ آپ... آپ وہ جمشید نہیں ہیں۔ ہو بھی نہیں سکتے۔ آواز سے آواز کا رشتہ ہی سچا رشتہ ہے۔ باقی سب دھوکہ ہے۔"

"ممی..." سریلی آواز نے گھبرا کر اسے مخاطب کیا۔ وہ ہوش میں آگئی۔ پوری آنکھیں کھول کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اور جلدی سے سفینہ کا ہاتھ تھام کر روشنیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اور بہروز کے پہلو میں رک گئی۔ بہروز نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ بڑی چاہت سے کہا۔

"اب چلیں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلا دی جیسے ڈر رہی ہو کہ زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکل جائے جو اس کی شخصیت کی پراگندگی کا اعلان کر دے۔

بہروز نے سفینہ کو گود میں اٹھا لیا۔ اور وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی کلب کی عمارت سے باہر نکل آئی۔ سفینہ کے پہلو میں لیٹے ہوئے اس نے اپنا محاسبہ کیا۔

وہ اس حد تک کیسی گر گئی کہ ایک اجنبی مرد کی طرف صرف نام سن کر کھنچی چلی گئی۔ اور وہ مرد اپنی باوقار شخصیت کے برخلاف کیسا چھچھورا نکلا۔ کاش وہ اپنی ذات کا بھرم ہی رکھ لیتا۔ اسے آرام سے ٹوک دیتا کہ وہ اس کا جمشید نہیں ہے۔ وہ کسی خوشی کو نہیں جانتا۔ لیکن...وہ ایک عام مرد ہی نکلا کیونکہ وہ جمشید صرف نام کا تھا۔ لیکن شاید ہر جمشید ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ ایک عام مرد۔ جو آواز کی کشش پر یقین نہیں رکھتا۔ آواز کا رشتہ دیرپا نہیں ہوتا۔ صوتی لہروں کے دوش پر سوار کتنی ہی آوازیں خلا میں جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ مٹ جاتی ہیں۔ اس کی آواز بھی خلا کا حصہ بن کر ختم ہوگئی۔ مٹ گئی۔ آخر وہ کب تک دھوکا کھائے گی۔

حقیقت سے آنکھیں چرانے والے تمام عمر سراب کے پیچھے بھاگتے ہیں اور بھاگتے بھاگتے تھک جاتے ہیں۔ وہ بھی تھک گئی ہے۔ بہت تھک

گئی ہے۔ اسے بہروز کو حقیقت مان کر اپنا آپ پوری سچائی سے اس کے حوالہ کر دینا چاہیے۔

اس نے بہروز کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھراتے ہوئے بڑی طمانیت محسوس کی۔ اور اس کے بازو پر سر رکھ کر خوابوں میں کھونے کی اداکاری کرنے لگی۔ کانوں کے قریب متواتر ایک آواز سرگوشیاں کر رہی تھی۔ "خوشی.... خوشی... خوشی۔"

سفینہ اسکول جانے لگی تھی۔ تب ایک دن بہروز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"رمشہ جان! کیا تم نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ تم میرے ساتھ سخت زیادتی کر رہی ہو؟"

وہ خجل ہو گئی۔ سچ تو کہہ رہے ہیں بہروز۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ زیادتی کی مرتکب ہوتی ہے۔ بے چارہ بہروز۔

اس نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"اب ایسا نہیں ہوگا۔ یقین مانیے۔"

"سچ کہہ رہی ہو؟" بہروز خوش ہو گیا۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر بچوں جیسی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔" اس نے وثوق سے کہا۔

"بس پھر جلدی سے ایک بیٹا ہمیں تحفے میں دے دو۔ ہماری دنیا مکمل ہو جائے گی۔" فرمائش کی وہ ہنس دی۔

بالکل ایک عام سا مرد، نارمل شوہر، کاش اسے محبت کا ادراک ہوتا۔ لیکن اسے تو ایک تابعدار بیوی اور بچے چاہیے۔ تاکہ اس کی دنیا، اس کا خاندان مکمل ہو جائے۔ وہ کتنی ادھوری ہے اسے ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ اور ہو بھی کیوں۔ وہ اس کی کھیتی بھی تو ہے۔ ایک زمین جس پر بوئے گئے بیج کی آبیاری اس کا فرض ٹھہرا۔

امروز کو پا کر بہروز اتنا خوش ہوا جیسے پوری کی

غزل

ضمیر احمد رستھ پوری

یہ ضروری نہیں ہے جہاں دیکھنا
وہ جدھر کو چلے بس وہاں دیکھنا
ان کی قسمت میں تھی ایسی منظر کشی
پنکھڑی سے لبوں پر دھواں دیکھنا
کوئی آتا نہیں، کوئی جاتا نہیں
ایسا سنسان کوئی مکاں دیکھنا
جھاڑ نے اپنے پھل کو سکھایا نہیں
دوسروں کے گھروں میں اماں دیکھنا
لے گیا جو بچھڑ کے ملا تھا ابھی
ایسے عالم میں دل کا سماں دیکھنا
عمر کہتی ہے چھوڑو بھا یہ چلن
چلتے پھرتے نظر سے جواں دیکھنا
میں ترستا رہا تیرے ملنے کو یار
تو کہاں ہے ضمیر، اب کہاں دیکھنا

پوری کائنات اسے حاصل ہو گئی ہو۔ اس نے سوچا چلو بے چارہ ایسے ہی خوش ہوتا ہے تو اس کا کیا جاتا ہے؟

بہروز نے اسے تحفہ میں ایک خوبصورت کوٹھی تعمیر کرا کے دی۔ اسے قیمتی فرنیچر اور نایاب ساز و سامان سے سجایا سنوارا۔ کوٹھی کے وسیع لان میں خوبصورت پودے لگوائے۔ پورچ کے ستون پر پھولدار بیلیں چڑھا دیں۔ ہیرے اور پلاٹینم کے زیورات سے اسے لاد دیا۔ الماریوں میں دیدہ زیب قیمتی لباس بھر دیے۔ خاص طور پر اس کے لیے امپورٹیڈ کار خرید کر پورچ میں کھڑی کر دی۔ جب پہلے دن وہ اس کا ہاتھ تھام کر نئی کوٹھی میں داخل ہوا۔ تو بڑے فخر سے کہا۔

digest library.com

"یہ.... یہ سب تمہارے لیے ہے۔ میں بھی تمہارا ہوں صرف تمہارا۔" اس نے بڑی چاہت سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ موم کی طرح پگھل گئی.. اور آنسوؤں سے اسے عقیدت کا نذرانہ پیش کیا۔ بہروز نے اسے محبت سمجھا۔ اور اپنی دانست میں ٹھیک ہی سمجھا۔ وہ سرشار ہو گیا۔ اس کا بس چلتا تو اس پر اپنا آپ وار دیتا۔ اور جس پر اپنا آپ وار نے کے ثبوت میں اس نے اتنا کچھ کیا تھا وہ اس کے بازوؤں میں سمائی۔ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اتنا سب کچھ پا کر بھی زندگی کا خلا پر نہیں ہوا تھا۔ کیسی احسان فراموش تھی وہ۔ ندامت کا غلبہ ایسا شدید تھا کہ مر جانے کو جی چاہا۔ لیکن مر کر بھی وہ ندامت کا بوجھ اتارنے کے لائق نہیں تھی۔ سو مر کر کیا کرتی۔ اور بہروز کو اس کی زندگی عزیز تھی۔ سو وہ جینے پر مجبور تھی۔ دانیال اپنی دلہن کو لے کر آیا تھا۔ مشعل اس کی بیوی ہی نہیں اس کی محبوبہ بھی تھی۔ امی اور پاپا اپنا اپنا فرض ادا کر کے وہاں جا چکے تھے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ اس کے مائیکے کی واحد نشانی دانیال تھا۔ اور اب اس کی بیوی مشعل بھی میکہ کا ایک فرد بن چکی تھی۔ مشعل اوسط صورت شکل کی ایک عام سی لڑکی تھی۔ لیکن دانیال کی چاہت نے اس کو حسین تر بنا دیا تھا۔ مسرتوں کی آنچ سے تمتمایا اس کا چہرہ کامیاب اور پرسکون زندگی کی تمام تر دولت سے مالا مال اس کا وجود ایک نہ ختم ہونے والی خوشی سے سرشار وہ عام سی لڑکی دانیال کی نظر میں بہت خاص بن کر اس کی زندگی میں شامل تھی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ اور وہ انہیں خوش دیکھ کر نہال ہو رہی تھی۔ بہروز اور دانیال کی دوستی تو بہت پرانی تھی۔ عمر کے فرق کے باوجود وہ اچھے اور بے تکلف دوست تھے۔ خیر سے اب تو دانیال بھی شادی شدہ تھا۔ تو عمر کا فرق بالکل ہی مٹ گیا تھا۔ بہروز اور رمشہ ان کی آمد سے بہت خوش تھے۔ روز کہیں گھومنے پھرنے کا پروگرام بنا لیتے۔ ان کو قیمتی تحائف دیتے۔ لنچ اور ڈنر کا اہتمام کرتے۔ سفینہ اور امروز تو اپنے ماموں کے دیوانے تھے۔

اس شام وہ باہر نہیں گئے۔ رات کا کھانا بھی گھر ہی پر کھایا۔ مشعل کی طبیعت کسلمند تھی اس لیے وہ آرام کر رہی تھی۔ بہروز اور دانیال ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ دانیال کہہ رہا تھا۔

"بہروز بھائی! آپ کی خوشگوار زندگی دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ آپا کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں کہ وہ کبھی آپ سے چڑتی تھیں۔ دراصل میری آپا دل کی بہت اچھی ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ ورنہ شروع شروع میں تو خود میں بھی تذبذب کا شکار تھا۔ کہ وہ مجھے دل سے قبول کرتی ہیں یا نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہاری آپا نے مجھے زندگی کی ساری مسرتیں دیں۔ یہ گھر.... یہ بچے.... یہی میری مکمل دنیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔"

بہروز کا ہر لفظ محبت اور خلوص کی چاشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دانیال نے مسکرا کر اس کی تائید کی۔ رمشہ کافی کی ٹرے لے کر آئی اور ان کے سامنے بیٹھ کر کافی بنانے لگی۔ ابھی اندر آتے آتے اس نے دانیال اور بہروز کی گفتگو سنی تھی اور اسے بہروز پر ترس بھی آیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں ہمیشہ اچھا سوچتی تھی۔ اس کی قدر بھی کرتی تھی۔ لیکن محبت؟ محبت زبردستی نہیں کی جاتی۔ سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی۔ یہ تو ایک جذبہ بے اختیار ہے۔ اور اس پر ہمارا اور آپ کا اختیار نہیں ہوتا۔ یہ تو خود بخود کسی کے نام ہو جاتا ہے۔ جس کے نام یہ جذبہ ہوتا ہے کبھی کبھی تو خود اسی کو علم نہیں ہوتا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علم ہونے کے باوجود وہ پذیرائی نہیں کرتا۔ یا کر نہیں پاتا۔ پھر بھی یہ بے ایمان دل اسے بے وفا سمجھنے پر آمادہ نہیں

تھا۔ کچھ دنوں سے اس کا دل کچھ زیادہ ہی بے ایمان ہو رہا تھا۔ باغی ہو رہا تھا۔

کافی کا کپ بہروز کی طرف بڑھاتے ہوئے رمشہ کا ہاتھ کانپ گیا۔ پہلے کافی چھلکی۔ پھر کپ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ دانیال نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرہ کی اڑتی اڑتی رنگت دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

"کیا بات ہے آپا؟"

"سو.... سوری....." رمشہ ایک جانب جھکتی چلی گئی۔ اس کا ایک ہاتھ سینہ پر تھا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ بہروز نے اسے سنبھال لیا۔ دانیال سے کہا۔

"فوراً ڈاکٹر اکشوا ہا کو فون کرو۔ نمبر سامنے ڈائری میں ہے۔"

دانیال نے فون کیا۔ ڈاکٹر نے رمشہ کے کیفیت بتائی ڈاکٹر نے کہا۔

"میں ایمبولینس بھیج رہا ہوں۔ آپ فوراً مسز بہروز کو لے آئیں۔"

بہروز نے رمشہ کو صوفہ پر آرام سے لٹا دیا۔ اس کی پیشانی کا پسینہ صاف کیا۔ اور دھیرے دھیرے اس کا سینہ سہلانے لگا۔ دانیال جلدی سے مشعل کو بلا لایا۔

ڈاکٹر کشوا ہا کا نرسنگ ہوم قریب ہی تھا۔ ایمبولینس آ گئی۔ وہ سب اسے لے کر نرسنگ ہوم گئے۔ ڈاکٹر کی ٹیم اس کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی۔ وہ آئی سی یو کے باہر پریشان کھڑے تھے۔ بہروز کا برا حال تھا۔ چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک رمشہ کو کیا ہو گیا؟ اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ دانیال اسے سنبھال رہا تھا۔ تسلی دے رہا تھا۔ حالانکہ خود وہ بھی کم پریشان نہیں تھا۔ رمشہ کے سوا اس کا اب تھا ہی کون؟ وہ عمر میں اس سے صرف تین برس بڑی تھی۔ لیکن اس نے ہمیشہ اسے بہت چھوٹا سمجھ کر سنبھالا تھا۔ امی اور پاپا کے بعد تو وہ اس کی بزرگ ہی بن گئی تھی۔ جب اس نے مشعل کے بارے میں اسے بتایا اور اس کی اجازت طلب کی تو اس نے بڑی فراخ دلی سے اسے اجازت دے دی۔ اور بڑے پیار سے کہا۔

"دانی! میرے بھائی! لڑکیوں کا دل بہت نازک ہوتا ہے۔ تم مشعل کو ہمیشہ پیار دینا۔ اس کے دل کو کانچ کی طرح سنبھال کر رکھنا۔"

کام کی باتیں

☆ اللہ کے دیے ہوئے پر راضی ہو جا ورنہ کوئی ایسا مالک تلاش کر جو اس سے زیادہ دے سکے۔ (حضرت داؤدؑ)

☆ زیادہ باتیں کر کے اپنے آپ کو بے وقوف ثابت مت کرو۔ (حضرت عمرؓ فاروق)

☆ ظالم کو معاف نہ کرو کیونکہ یہ مظلوموں پر ظلم کرتا ہے۔ (حضرت عثمانؓ)

☆ حاسد تمہاری خوشی سے غمگین ہوتا ہے اس کے لیے یہی کافی ہے تمہیں انتقام لینے کی ضرورت نہیں۔

☆ کسی کو اپنے سے کمتر نہ سمجھنا سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ بلند حوصلہ انسان کے ہاتھ میں آ کر مٹی بھی سونا ہو جاتی ہے۔ (حضرت لقمانؑ)

☆ کسی پر احسان کرو تو اسے چھپاؤ تم پر کوئی احسان کرے تو ظاہر کرو۔ (حضرت علیؓ)

digest library.com

اور آج خود اس کا دل جواب دے رہا تھا۔ وہ آئی سی یو میں بے ہوش پڑی تھی۔ اور وہ دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ جانے کب اس کی آنکھ سے آنسو ابلے۔ اور وہ تڑپ تڑپ کر رونے لگا۔ مشعل نے اسے سمجھایا۔

"دانی! بہروز بھائی کو دیکھیں۔ انہیں اس وقت ہماری ضرورت ہے۔ آپ خود اتنا بے حال ہوں گے تو انہیں کون سنبھالے گا۔"

دانی نے بہروز کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ جیسے دیوار کا سہارا نہ ملیا تو گر جائے گا۔ دانیال نے اسے صوفہ پر بٹھا دیا۔ اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔

خدا خدا کر کے ڈاکٹر کشواہا کی صورت نظر آئی۔ وہ سیدھے ان کے پاس آئے۔ اور انہیں دلاسہ دیا۔

"دل کا دورہ زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ اب مسز بہروز خطرہ سے باہر ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم انہیں چوبیس گھنٹے "انڈر آبزرویشن" رکھیں گے۔" آپ چاہیں تو گھر جا کر آرام کریں۔"

بہروز نے دانیال اور مشعل کو سمجھا بجھا کر گھر بھیج دیا۔ جب وہ لوگ رمشہ کو لے کر نرسنگ ہوم آئے بچے سو رہے تھے۔ آیا ان کے پاس تھی۔ دانیال تو جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن بچوں کی وجہ سے اسے جانا پڑا۔

بہروز بھلا رمشہ کو اس حال میں چھوڑ کر کیسے جاتا؟

دوسرے دن رمشہ کو اسپیشل وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کی حالت بہت بہتر تھی۔ لیکن انجیکشن کے زیر اثر غنودگی میں تھی۔ بہروز اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر سرگوشی کی۔

"مجھے چھوڑ کر نہ جانا خوشی! میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گا۔" رمشہ کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ آنکھیں کھولنا چاہیں تو کھل نہ سکیں۔ بس کانپ کر رہ گئیں۔ اس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ سماعتوں میں رس سا گھل گیا۔ 'خوشی... خوشی' یہ آواز سننے کے لیے وہ کب سے ترس رہی تھی۔ اس آواز کے انتظار میں اس کی زندگی کا ہر لمحہ تڑپتے ہوئے گذرا تھا۔ کئی بار اسے دھوکہ ہوا۔ کئی بار وہ اس کی طرف بے تابی سے لپکی بھی۔ وہ ظالم آیا بھی تو کب؟ جب اپنا ہی دل ساتھ چھوڑنے پر آمادہ ہے۔ ایک بار صرف ایک بار وہ اس بیدرد کو دیکھ تو لے۔ اس کی صورت کو اپنی آنکھوں میں بسا لے۔ ہمیشہ کے لیے اسے اپنی پتلیوں میں قید کر لے۔ وہ دنیا سے جائے تو اس کی تصویر کو ساتھ لے کر جائے۔ کہ اب وہ تصور نہیں۔ حقیقت ہے۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ نظروں کی دھند کو جھٹک کر دور کیا۔ وہ چہرہ اس کے سامنے تھا بہت جانا پہچانا، بہت شناسا، اس کے ہونٹ بار بار ایک ہی جملے کی گردان کر رہے تھے۔

"خوشی۔ مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گا۔ میں نے تمہیں بڑی منتوں کے بعد پایا ہے۔ اپنا وجود ختم کر کے تمہیں حاصل کیا ہے۔ آنکھیں کھول کر ایک بار اپنے جمی کو دیکھ لو۔ بہروز کے لیے نہ سہی۔ جمشید کے لیے سہی۔ تمہیں جینا ہوگا رمشہ۔ تمہیں میری خوشی بن کر زندہ رہنا ہوگا۔" وہ بلک رہا تھا۔

"آہ! وہی دلنشیں آواز، وہی لہجہ۔ محبت میں ڈوبا ہوا۔ پیار میں شرابور، خوشی.... خوشی... خوش.... بار بار خوشی کہہ کر پکارو مجھے۔ میں تمہارے ہونٹوں سے یہ نام سننے کو ترس گئی ہوں۔"

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ پھر موند لیں۔

"تو یہ تم تھے.... بے ایمان.... دغاباز... تم نے انکشاف کرنے میں اتنی دیر کیوں کی؟ میں کہاں کہاں خوار نہیں ہوئی۔ ساری دنیا میں تمہیں تلاش

کرتی رہی۔ اور تم.... تم .... میرے پاس... میرے قریب رہ کر بھی دور رہے؟"

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے تواتر سے پھیلتے رہے۔ بہروز نے ان آنسوؤں کو اپنی پوروں پر اٹھالیا۔ اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے۔ وہ دھیرے دھیرے سسکتی رہی۔ دل نے ایسا زبردست جھٹکا دیا تھا کہ سارا وجود طوفان کی زد میں آکر تہس نہس ہو گیا تھا۔ دل ہمک ہمک کر سینے سے باہر نکلنے کو بیتاب ہو رہا تھا۔ وہ اسے بہلا رہی تھی۔

"اب کیسی بیتابی؟ جس کے لیے یہ ساری تڑپ اور بے چینی تھی.... وہ.... وہ اتنے قریب ہے۔ بلکہ وہ تو شروع ہی سے اس کے قریب تھا۔ وہی بے وقوف تھی۔ جو اسے پہچان نہ سکی۔ اور جب پہچانا تو دل دھوکہ دینے کے لیے تیار ہے۔" یہ ہلکا ہلکا درد، یہ کسک، یہ سب کیا ہے۔ کیوں ہے؟"

"جم.... شید.... جمی۔" تم میرے جمی ہو نا؟"

اس نے تصدیق چاہی۔ بہروز نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"پھر چھپے کیوں؟ بتایا کیوں نہیں؟" شکوہ کیا۔

"کیا میرے جانے کا انتظار تھا؟"

"تمہیں بہروز سے نفرت جو تھی۔ تب میں نے ایک نیا پیکر تراشا۔ اس کا نام جمشید رکھا۔ اور جمشید نے تمہیں اپنی پسند کا نام دے ڈالا۔ خوشی۔" وہ بتا رہا تھا۔

"میں اب مرنا نہیں چاہتی۔ اپنے جمشید کے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔ خوشی بن کر زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا خوشی۔ تمہیں امریکہ لے جاؤں گا۔ وہاں تمہارا بہترین علاج کراؤں گا۔ ہم ایک ساتھ جئیں گے۔ ایک نئی زندگی کی شروعات کریں گے۔ بولو خوشی۔ جواب دو۔"

اور رمشہ نے اپنی دونوں بانہیں بہروز کی گردن میں حمائل کر دیں۔ اور اقرار اتنا دلنواز تھا کہ بہروز اس کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ رمشہ نے ایک آسودہ سی سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔ وہ دوبارہ جی اٹھی تھی۔

آواز سے آواز کا رشتہ۔ آج ہمیشہ کے لیے تکمیل کی منزل سے ہمکنار ہو گیا تھا۔

★★

اقوالِ زرّیں

☆ بہت بڑا گناہ ہے کہ تم وہ بات کہو جو تم نہیں کرتے۔ (فرمان الٰہی)

☆ ایمان کے بعد افضل ترین نیکی خلق کو آرام دینا ہے۔ (حضرت محمد ﷺ)

☆ اس دن پر رو جو تیری عمر کا گزر گیا اور اس میں نیکی نہیں کی۔
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

☆ جو شخص اپنا راز پوشیدہ رکھتا ہے گویا اپنی سلامتی کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔
(حضرت عمر فاروقؓ)

☆ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
(حضرت عثمان غنیؓ)

☆ سچائی کی مشعل جہاں دکھائی دے اس سے فائدہ اٹھاؤ، یہ نہ دیکھو کہ مشعل بردار کون ہے۔ (حضرت عائشہ صدیقہؓ)

☆ اگر روزی عقل سے حاصل کی جاتی تو دنیا کے تمام بے وقوف بھوکے مر جاتے۔
(شیخ سعدی)

☆ اللہ کے دشمنوں کے ساتھ الفت کرنا اللہ کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔
(مجدد الف ثانیؒ)

digest library.com